آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2019

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

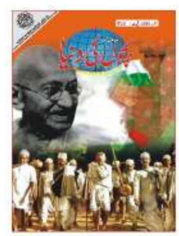

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

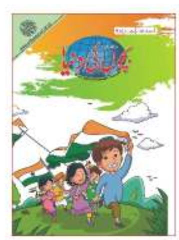
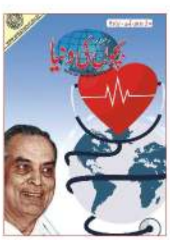

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون:040 - 24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	سروجنی نائیڈو ایک عہد ساز خاتون	ڈاکٹر راحت سلطانہ	5
روبرو	جامعہ کی ترقی میرا مشن ہے: پروفیسر نجمہ اختر	زیب النساء	10
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		14
جہان نسواں	جدیدیت کی تحریک: ایک جائزہ	ڈاکٹر کائنات انصاری	15
	مرد اور عورت کے مابین تفریق کیوں؟	طارق سہراب غازی پوری	21
	رسالہ 'جامعہ' کی تعلیمی وادبی خدمات (ایک جائزہ)	ڈاکٹر فرزانہ خلیل	24
	جدید فارسی شاعری میں ایرانی شاعرات کا مقام	ڈاکٹر محمد عرفان	27
	ملک کی آئین سازی میں خواتین کا کردار	عبدالواحد	32
	جنسی استحصال کا معروضی جائزہ	ناز آفرین	37
	وحید الہ آبادی کی شاعری میں تصوف	مہر فاطمہ	40
	اہم شعری اصناف میں ہندوستانی تہذیب	تبسم پروین	44
کہانیاں	تقدیر کا فیصلہ	خلیق النساء	48
	بھرم	آسیہ رئیس خان	51
حسن سخن	شہناز فاطمہ صدیقی		53
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		54
صحت	دوران حمل خون کی کمی: احتیاط وعلاج	ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی	56
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 12 دسمبر 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد- 500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

معاشرے کی تشکیل میں تعلیمی اداروں کا بہت اہم رول ہوتا ہے چاہے وہ پرائیویٹ ادارے ہوں یا سرکاری۔ یہ طلبا کی ذہن سازی کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ایسا ہی ادارہ ہے جس نے نہ صرف ذہنوں کی آبیاری کی بلکہ ایک ایسی قوم کی نمائندگی بھی کی جو تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ تھی۔ جامعہ سے وابستہ بہت سی ایسی مقتدر شخصیات ہیں جنھوں نے ادب وفن کے مختلف میدانوں میں اپنی نمایاں کارکردگی سے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ دراصل ابتدا سے ہی یہ یونیورسٹی ایک فکری اور عملی تحریک کی حامل رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے اساتذہ نے کئی دہائیوں تک طلبا کی ذہن سازی کی ہے اور ان کو تعلیم کے متعدد ایسے شعبے فراہم کیے جن کا مقصد جامعہ میں بہتر اور معیاری تعلیم کی فراہمی ہے تاکہ طلبا کے لیے تعلیمی فضا کو اور سازگار بنایا جاسکے اور انھیں سائنس یا دیگر شعبوں میں داخلہ لینے کے لیے دوسری جگہ کا رخ نہ کرنا پڑے۔ جیسا ماحول وہ چاہتے ہیں وہ ان کو یونیورسٹی میں ہی میسر آسکے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بیک وقت بہت سے ملکوں اور علاقوں کے لوگ مستفید ہورہے ہیں۔

جامعہ کے بنیاد گزاروں میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری اور عبدالمجید خواجہ کے نام سرفہرست ہیں۔ 1920 میں علی گڑھ کی جامع مسجد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھوں جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ کچھ وقت کے بعد مالی مشکلات کی بنا پر 1925 میں اس کو دہلی منتقل کردیا گیا لیکن جامعہ اپنی منزل کی جانب مسلسل گامزن رہا۔ 1962 میں جامعہ کو ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا۔ 1988 کو جامعہ کے حق میں پارلیامنٹ نے ایک بل بھی پاس کیا جس کے بعد جامعہ کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوگیا۔

جامعہ نے تعلیمی میدان میں بہت تیزی سے ترقی کی ہے۔ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم کے کم وبیش تمام شعبے موجود ہیں۔ ان شعبوں کی نمایاں کارکردگی سے بیشتر افراد واقف ہیں۔ روز بہ روز جامعہ میں نئی تحقیق بھی سامنے آرہی ہے، چاہے وہ ادبی تحقیق ہو یا سائنسی تحقیق۔ مختلف شعبوں کی نئی نئی تحقیقات کی روشنی میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جامعہ کے تمام شعبے فعال ہیں اور آنے والے وقت میں وہ اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے۔ طلبہ وطالبات کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے جامعہ کی موجودہ وائس چانسلر نے وزیر اعظم سے میڈیکل کالج کے قیام کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

اکیسویں صدی میں خواتین نے ہر سطح پر اپنی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے پھر بھی ہم ان کی خودمختاری پر سوال قائم کرتے ہیں۔ خواتین کے تعلق سے ہمارا یہ رویہ تشویشناک ہے۔ ہمیں فراخدلی کے ساتھ ان کی قربانیوں اور کارکردگی کا معترف ہونا چاہیے اور آگے بڑھنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے حوالے سے اس شمارے میں جامعہ کی پہلی خاتون وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر کا انٹرویو شامل ہے۔ دوسری تحریر رسالہ 'جامعہ' کے حوالے سے ہے۔

'خواتین دنیا' کی تعریف ہمیں تاثرات کے ذریعے آپ لوگوں سے ملتی رہتی ہے۔ قارئین اس میں شائع ہونے والے مضامین اور کہانیوں کو سراہتے ہیں اور اس کی آرائش وزیبائش سے متاثر نظر آتے ہیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں اس رسالے میں اردو کی اہم شخصیات پر انٹرویو بھی شائع ہوئے ہیں جسے قارئین نے کافی پسند کیا۔ رسالے کو آگے بڑھانے میں قارئین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ 'خواتین دنیا' کے بارے میں اپنے تاثرات سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔ آپ کے تاثرات کا انتظار رہے گا۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

شخصیت

ڈاکٹر راحت سلطانہ

سروجنی نائیڈو

ایک عہد ساز خاتون

بلبل ہند مسز

سروجنی نائیڈو نہ صرف ایک مجاہدۂ آزادی ہند اور ایک باکمال انقلابی شاعرہ تھیں بلکہ ادب اور سیاست کے میدان میں انھوں نے متعدد کارہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں۔ محب وطن ہندوستانی خواتین میں انھیں آزاد ہندوستان کی پہلی خاتون گورنر بننے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔

سروجنی نائیڈو نے 13 فروری 1879 کو حیدرآباد کے ایک خوش حال برہمن خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد رگھوناتھ چٹوپادھیائے ایک ممتاز ماہر تعلیم اور اپنے وقت کے مشہور سائنسداں تھے۔ ان کی والدہ وردا سندری ایک حساس دل رکھنے والی شاعرہ اور سماجی کارکن تھیں۔ سروجنی نائیڈو کے آٹھ بہن بھائی تھے جن میں وہ سب سے بڑی تھیں۔ ان کے والد رگھوناتھ چٹوپادھیائے مشرقی بنگال کے ایک گاؤں برہم نگر کے متوطن تھے۔ وہ سنسکرت کے علاوہ انگریزی، جرمنی، روسی اور اسرائیلی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی بیٹی سروجنی بھی انگریزی زبان میں مہارت حاصل کرلے۔ لیکن سروجنی کو انگریزی زبان کے سیکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے ان کے والد نے اپنی کمسنی بیٹی کو سزا کے طور پر ایک دن گھر کے ایک کمرے میں بند رکھا۔ سروجنی نائیڈو کو اس سزا کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے اپنے والد کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انگریزی زبان پر عبور و مہارت حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا۔ انگریزی زبان و ادب کا انھوں نے اس قدر انہماک سے مطالعہ کیا کہ نہ صرف انھیں اس زبان میں لکھنے پڑھنے کی مہارت حاصل ہوگئی بلکہ ان کا شمار انگریزی کی باکمال شاعرات اور مقررین میں بھی ہونے لگا۔ اپنے والد کی انگریزی زبان سے دلچسپی کے پیش نظر سروجنی نائیڈو نے دیگر زبانوں پر عبور رکھتے ہوئے بھی سوائے انگریزی کے کسی اور زبان میں تصنیف و تالیف کا کام انجام نہیں دیا۔

سروجنی نائیڈو ایک طرف محب وطن، قوم پرست لیڈر اور شیریں بیان مقرر تھیں تو دوسری طرف حیدرآبادی تہذیب وثقافت کا بے مثال نمونہ اور انگریزی ادب کی ایک انقلابی شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے ملک و قوم، تاریخ وادب اور تہذیب وتمدن کی بیش بہا اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔

’سروجنی نائیڈو ایک طرف محب وطن، قوم پرست لیڈر اور شیریں بیان مقرر تھیں تو دوسری طرف حیدر آبادی تہذیب و ثقافت کا بے مثال نمونہ اور انگریزی ادب کی ایک انقلابی شاعرہ بھی تھیں۔ انھوں نے اپنے ملک و قوم، تاریخ و ادب اور تہذیب و تمدن کی بیش بہا اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں‘

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ سروجنی نائیڈو کے والد مشرقی بنگال کے رہنے والے تھے۔ اس لیے ان کے گھر میں والدین بنگالی میں گفتگو کرتے تھے۔ اس زبان کے بشمول ان کے گھر میں چار زبانوں کا چلن تھا۔ والدین جب اپنے بچوں سے بات کرتے تو انگریزی زبان استعمال ہوتی تھی۔ گھر کے ملازموں سے تلگو میں گفتگو کی جاتی اور گھر آنے والے مہمانوں اور دیگر افراد سے گفت وشنید کی زبان اردو تھی۔

جہاں تک سروجنی نائیڈو کی شاعری کا تعلق ہے انھوں نے ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران گیارہ برس کی عمر ہی سے انگریزی میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ جب وہ بارہ سال کی ہوئیں تو میٹرک کا امتحان مدراس یونیورسٹی سے نہ صرف امتیاز کے ساتھ پاس کیا بلکہ اس امتحان میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کر کے ایک ریکارڈ بھی قائم کیا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ اس زمانے میں حیدرآباد میں لڑکیوں کی تعلیم و تدریس کے لیے کوئی معیاری اسکول نہ تھا اور جنوبی ہند کے تمام مدارس، مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھے۔ جب سروجنی نائیڈو کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو انھوں نے انگریزی میں متعدد مضامین اور ایک ناول بھی تصنیف کیا۔ چنانچہ اپنی کتاب ’’گولڈن تھریشولڈ‘‘ میں لکھتی ہیں:

’’ایک روز جب میں گیارہ سال کی تھی تو الجبرا کا ایک سوال مجھے بری طرح پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس کا جواب کسی طرح نکل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے بدلے ایک مکمل نظم مجھ پر نازل ہوگئی۔ میں نے اسے لکھ لیا اور اسی روم سے میری شاعرانہ زندگی کی ابتداء ہوئی۔ تیرہ سال کی عمر میں میں نے دو ہزار مصرعوں کا ایک مکمل جذباتی ڈرامہ لکھا...... میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ مطالعہ میں نے چودہ اور سولہ سال کی عمر کے دوران ہی کیا ہے۔ میں نے ایک ناول لکھا اور بے شمار صحافتی مضامین بھی۔‘‘

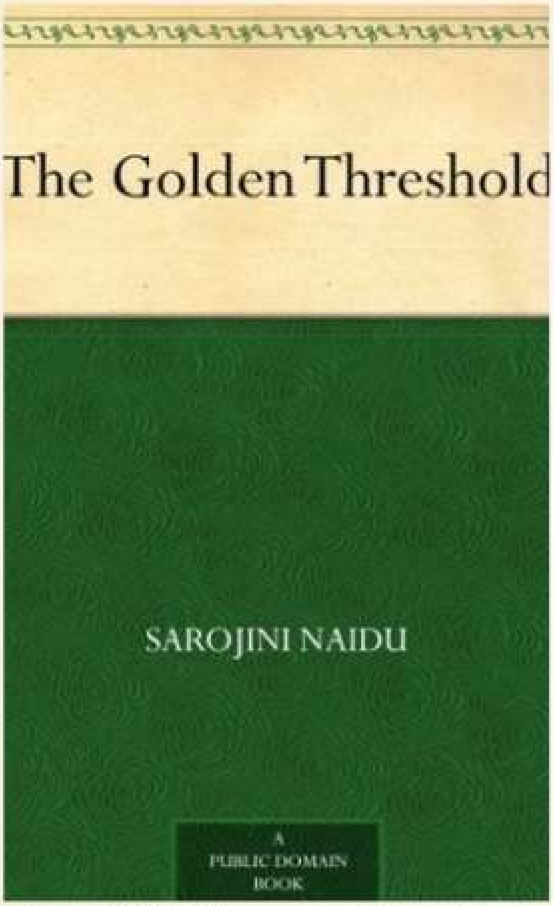

حکومت حیدرآباد کی جانب سے سروجنی نائیڈو کو وظیفہ عطا کر کے، اعلیٰ تعلیم کے لیے 1894 میں انگلستان بھیجا گیا۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال تھی۔ جہاں انھوں نے تین سال تک تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال سے ان کی دوستی ہوگئی۔ اقبال کے متعدد اشعار انھیں ازبر ہو گئے تھے۔ جن کا وہ اپنی تقاریر میں برمحل استعمال کیا کرتی تھیں۔ علامہ سے ان کی یہ دوستی آخر عمر تک برقرار رہی جب اقبال کے سخت بیمار ہونے کی اطلاع انھیں ملی تو مسز نائیڈو نے لاہور پہنچ کر ان کی عیادت کی۔ خود علامہ اقبال بھی سروجنی نائیڈو کی بہت عزت کرتے تھے۔ مسز نائیڈو کے حیدرآباد

'حکومت حیدر آباد کی جانب سے سروجنی نائیڈو کو وظیفہ عطا کر کے، اعلیٰ تعلیم کے لیے 1894 میں انگلستان بھیجا گیا۔ اس وقت ان کی عمر سولہ سال تھی۔ جہاں انہوں نے تین سال تک تعلیم حاصل کی۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال سے ان کی دوستی ہو گئی۔ اقبال کے متعدد اشعار انہیں از بر ہو گئے تھے۔ جن کا وہ اپنی تقاریر میں بر محل استعمال کیا کرتی تھیں۔ علامہ سے ان کی یہ دوستی آخر عمر تک برقرار رہی جب اقبال کے سخت بیمار ہونے کی اطلاع انہیں ملی تو مسز نائیڈو نے لاہور پہنچ کر ان کی عیادت کی۔ خود علامہ اقبال بھی سروجنی نائیڈو کی بہت عزت کرتے تھے۔ مسز نائیڈو کے حیدر آباد واپس ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد جب یہاں اقبال کے انتقال کر جانے کی خبر پہنچی تو حیدر آباد میں منعقد ہونے والے اقبال کے سب سے بڑے تعزیتی جلسے کی انہوں نے صدارت کی اور اپنی تقریر میں شاعر مشرق کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔'

واپس ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد جب یہاں اقبال کے انتقال کر جانے کی خبر پہنچی تو حیدر آباد میں منعقد ہونے والے اقبال کے سب سے بڑے تعزیتی جلسے کی انھوں نے صدارت کی اور اپنی تقریر میں شاعر مشرق کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔

لندن سے اگر چہ کہ وہ بغیر کسی تعلیمی سند حاصل کیے ہندوستان آگئی تھیں لیکن لندن کے ادبی ماحول میں ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا اچھا موقع ملا۔ وہ رائل لٹریری سوسائٹی کی رکن بن گئیں اور متعدد یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند سے نوازا۔ کم وبیش تین سال (1895 تا 1898) لندن میں ان کا قیام رہا۔ 2 ستمبر 1898 کو ڈاکٹر گوندا راج لونائیڈو سے ان کی شادی ہوگئی۔ یہاں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ سروجنی نائیڈو لندن جانے سے پہلے ہی ڈاکٹر نائیڈو کی محبت میں گرفتار ہوگئیں تھیں لیکن ان کے والدین اس شادی کے خلاف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سروجنی نائیڈو کو اس محبت کی شادی سے باز رکھنے کے لیے ان کے والدین نے انھیں لندن بھجوایا تھا لیکن ان کی محبت اپنی جگہ برقرار رہی اور بالآخر ڈاکٹر نائیڈو اور سروجنی دیوی ایک دوسرے کے شریک زندگی بن گئے۔

مسٹر اور مسز نائیڈو کی یہ شادی ہندوستان میں ذات پات کے فرق و امتیاز کے خلاف ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ پدمنی سین گپتا کے قول کے مطابق " ان کی شادی سے ہندوستانی سماج میں بہت سی اصلاحات کی بنیاد پڑی۔ یہ شادی ذات پات ہی نہیں علاقائی حدود سے بھی اوپر اٹھ کر کی گئی تھی اس لیے ان بہت سے فرسودہ تصورات پر کاری ضرب لگی۔ جو اب تک برصغیر کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ اس وقت خصوصی شادی قانونی ACTIII of 1872 پر عمل کیا گیا۔ یعنی دونوں فریقوں کو اس بات سے انکار کرنا پڑا کہ ان کا تعلق ہندو، سکھ، عیسائی، مسلم یا جین کسی بھی مذہب سے تھا۔

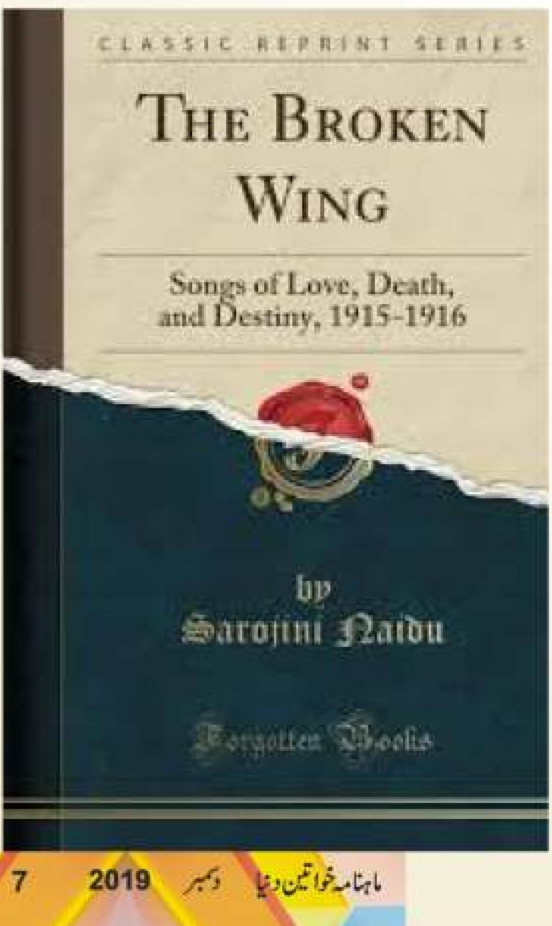

سروجنی نائیڈو انگریزی کی ایک باصلاحیت مصنفہ اور شاعرہ تھیں بلکہ انگریزی نظم ونثر میں ان کے متعدد مضامین، ایک ناول اور تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''دی گولڈن تھریشولڈ'' یعنی 'طلائی چوکھٹ' کے نام سے 1905 میں لندن سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد 1912 اور 1917 میں ''دی برڈ آف ٹائم'' (طائر وقت) اور ''دی بروکن ونگ'' (شکستہ بال وپر) کے نام سے دو اور شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ مسز نائیڈو کی وفات کے بارہ سال بعد ان کی بیٹی پدمجا نائیڈو نے ان کے غیر مطبوعہ کلام کو یکجا کر کے ایک اور شعری مجموعہ ''دی فیدر آف دی ڈان'' (صبح کے پر) مرتب کر کے 1961 میں شائع کیا۔

ایک انقلابی شاعرہ ہونے کے ناطے ان کی آواز صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے محب وطن قارئین تک پہنچی۔ ان کی شاعری میں ایک طرف ہندوستانی عوام کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے تو دوسری طرف یہاں کی تہذیب وثقافت بھی اس میں رچ بس گئی۔ خواتین کے حقوق کے لیے سروجنی نائیڈو نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ بقول ڈاکٹر بانو سرتاج 1919 میں مونٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات، میں خواتین کے لیے کسی طرح کا کوئی حق دینے کا اعلان نہیں ہوا تو سروجنی نے 800 خواتین کے دستخط حاصل کر کے حکومت کو میمورنڈم پیش کیا۔

سروجنی نائیڈو 1921 میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے میں کامیاب ہوئیں۔ اس کے بعد انھوں نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں

'سروجنی نائیڈو 1921 میں عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے میں کامیاب ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں خواتین کو ساتھ لے کر مظاہرے کیے۔ اسی سال کنگسلے ہال لندن میں جلیاں والا باغ کے واقعے میں مانٹریل قانون نافذ کرنے کے دوران خواتین پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ 1921 میں پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد پر ہوئے فسادات میں بے گناہوں پر ڈھائے گئے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنا ''قیصر ہند' کا خطاب حکومت کو واپس کر دیا۔ جب مہاتما گاندھی 1922 میں جیل گئے تو اپنی غیر موجودگی میں اپنی قائم مقامی کے لیے سروجنی نائیڈو کا انتخاب کیا۔ انہوں نے مسز نائیڈو سے کہا تھا'' تمہارے ہاتھوں میں بھارت کی ایکتا کا کام پورے اعتماد کے ساتھ سونپتا ہوں۔'' سروجنی نائیڈو نے مہاتما گاندھی کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھ کر پوری ذمہ داری سے اپنا فرض نبھایا۔'

خواتین کو ساتھ لے کر مظاہرے کیے۔ اسی سال کنگسلے ہال لندن میں جلیان والا باغ کے واقعے میں مانٹریل قانون نافذ کرنے کے دوران خواتین پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی۔ 1921 میں پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد پر ہوئے فسادات میں بے گناہوں پر ڈھائے گئے مظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنا ''قیصر ہند'' کا خطاب حکومت کو واپس کر دیا۔ جب مہاتما گاندھی 1922 میں جیل گئے تو اپنی غیر موجودگی میں اپنی قائم مقامی کے لیے سروجنی نائیڈو کا انتخاب کیا۔ انھوں نے مسز نائیڈو سے کہا تھا ''تمھارے ہاتھوں میں بھارت کی ایکتا کا کام پورے اعتماد کے ساتھ سونپتا ہوں۔'' سروجنی نائیڈو نے مہاتما گاندھی کے حکم کو سر آنکھوں پر رکھ کر پوری ذمہ داری سے اپنا فرض نبھایا۔

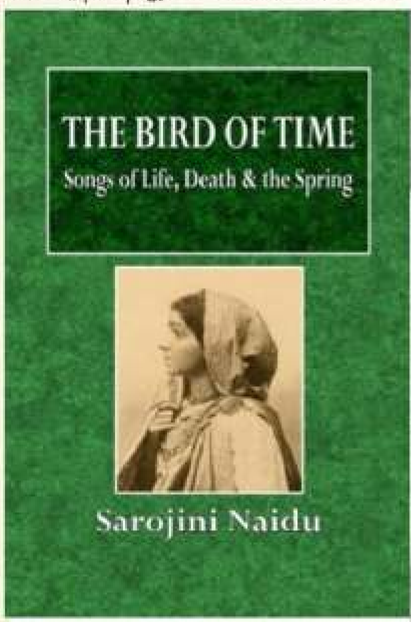

1930 میں گاندھی جی کے ساتھ انھوں نے جنوبی افریقہ میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ 1942 میں ''بھارت چھوڑو'' تحریک میں اہم کردار نبھایا۔ اس عظیم المرتبت مجاہدۂ آزادی نے 2 مارچ 1949 کو انتقال کیا۔ ''بھارت کوکیلا'' (Nightengale of India) کے نام سے یاد کی جانے والی اس خاتون کی زندگی کا ایک بے نظیر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی عوام میں بھائی چارگی کے رجحان کو عام کرنے اور اس ملک کی جنگ آزادی کی جدوجہد کے علاوہ خواتین کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں بڑے گہرے اور ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ گاندھی جی نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ''غریب تک غریب ہی سوچ کی مدد سے پہنچنے کی کوشش کرو، یہی سبب ہے کہ سروجنی نائیڈو نے ہندوستانی غریبوں، مفلسوں اور محنت کشوں کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ مادر وطن کی خدمت کے لیے یوں تو کئی مرد رہنماؤں نے اپنی جان تک نچھاور کر دی تھی لیکن سروجنی نائیڈو جنگ آزادی کی پہلی خاتون مجاہدہ ہیں جنھیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں اولیت کا شرف حاصل ہوا۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھیں حکومت حیدر آباد نے وظیفہ دے کر اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ کیا۔ وہ ہندوستان کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے انگریزی شاعری میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا۔ وہ واحد خاتون تھیں جنھیں گاندھی جی کے ساتھ ستیہ گرہ میں حصہ لینے کا امتیاز حاصل ہوا۔ وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کی پہلی خاتون صدر تھیں۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جنھوں نے امریکہ کا دورہ کر کے گاندھی جی کے پیغام کو عام کیا۔ مزید برآں ہندوستانیوں اور افریقیوں کے حقوق کے سلسلے میں جدوجہد کی۔ وہ ہندوستان کی پہلی خاتون گورنر منتخب ہوئیں۔ سروجنی نائیڈو کا ایک بڑا مقصد حیات ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یگانگت، بھائی چارگی اور قومی یکجہتی کے رشتے کو جوڑنا تھا۔ وہ ایک برہمن خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت حیدر آباد کے مسلم ماحول میں ہوئی۔ چنانچہ اکثر کہا کرتی تھیں 'میری شخصیت کی تعمیر میں ہندو دھرم اور مذہب اسلام دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔'

(ماخوذ: ادب اور خواتین، ڈاکٹر راحت سلطانہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2012)

زیب النساء

”جامعہ کی ترقی میرا مشن ہے“

پروفیسر نجمہ اختر

سوال: سب سے پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں۔

جواب: میرا نام نجمہ اختر ہے۔12/اپریل2019 سے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وائس چانسلر بن کر آئی ہوں۔اس سے پہلے قریب تیس سال پروفیسر رہی۔ یونیورسٹی ٹیچنگ میں یا ایڈمنسٹریشن میں کسی شکل میں میں 42 سال تک کام کر چکی ہوں۔

سوال: آپ نے کہاں سے تعلیم حاصل کی؟ اور آپ نے کن کن موضوعات پر کام کیا؟ اور کن تعلیمی اداروں سے آپ کا تعلق رہا ہے؟

جواب: میری تعلیم کانونٹ (Convent) اسکول الہ آباد میں ہوئی۔اس کے بعد جہاں جہاں والد صاحب کا ٹرانسفر ہوتا رہا وہاں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ میری تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ وہیں سے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی۔اس کے بعد تعلیم میں ماسٹر کیا اور پھر ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی کی۔

سوال: کس موضوع میں آپ کی زیادہ دلچسپی رہی اور آپ کی ریسرچ کا موضوع کیا تھا؟

جواب: شروع میں پڑھاتی تھی۔ Botany میں میں نے ٹاپ بھی کیا تھا اور گولڈ میڈل بھی حاصل کیا۔ ایجوکیشن ایڈمنسٹریشن میں جن جن علاقوں میں رہی ہوں یا پڑھانے میں بھی، ان دونوں میں میری دلچسپی رہی ہے۔ان سب میں جو High Light کیا وہ بطور مضمون تعلیمی انتظامیہ تھا آپ ان ٹیچرس کو دیکھیے جو بی ایڈ کر کے آتے ہیں وہ تربیت یافتہ ہو کر آتے ہیں۔ لیکن جو منتظم ہوتے ہیں وہ کبھی تربیت یافتہ نہیں ہوتے۔ وہ اچھے استاد تو ہو سکتے ہیں لیکن اچھے منتظم نہیں ہو پاتے۔ میرا رجحان سائنس میں تو تھا لیکن میرا مقصد یا دلچسپی ایڈمنسٹریٹر کو تربیت دینا تھا جو اس عہدے پر جوائن کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ وہ اس کام کے لیے Trained ہیں کہ وہ اپنے اس عہدے کو بخوبی انجام دے سکیں جیسا کہ ان سے توقع کی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دوسرے مضمون میں جیسے خواتین کی تعلیم اور صنفی تعلیم اور اسکولی سطح کی تعلیم بھی میری دلچسپی رہی ہے خاص طور پر تعلیم کی ضلعی طور پر منصوبہ بندی میں۔

سوال: جامعہ کی ترقی کے لیے آپ کن کن منصوبوں پر کام کرنا چاہتی ہیں؟ کیا جامعہ کی موجودہ جگہ تعلیمی ضروریات اور متعلقہ سرگرمیوں کے لحاظ سے کافی ہے؟

جواب: جامعہ کی جگہ بہت اچھی ہے۔ جتنی اچھی ہے میں اس سے بہتر کرنا چاہتی ہوں۔ کچھ نئے ٹاپک کچھ نئے مضمون اور کچھ نئے شعبے بھی کھولنا چاہتی ہوں۔ اسی کے ساتھ جو ہماری مقامی سہولیات ہیں جیسے رہائشی سہولیات یا اسپورٹس ان کو بھی بہتر کرنا چاہتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہاں کے طالب علم کچھ کرتے نہیں۔ ابھی ہمارے نارتھ زون کے ہاکی ٹورنامنٹ میں جامعہ کی ٹیم جیتی۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کی ہاکی ٹیم نہیں ہے۔ یہاں لڑکیوں کی ٹیم بھی ہونا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھیں گی۔

سوال نمبر: مسلمانوں میں خاص طور سے مسلم طالبات میں تعلیم کا رجحان بڑھا ہے لیکن زیادہ سے زیادہ لڑکیاں داخلہ لے سکیں اس کے لیے کوئی خاص کوشش ہوگی؟

جواب: یقیناً کوشش ہوگی اس کی۔ اگر ہم ان کو داخلہ دیتے ہیں تو وہ اکیلے ان کا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے والدین کا فیصلہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں خاص بات تو یہ ہے کہ والدین کو ان کے محفوظ رہنے کا بھروسہ دلانا بھی ضروری ہے کہ ان کی بچیاں یہاں محفوظ ہیں۔ ہاں......! اگر جامعہ لڑکیوں کے کچھ کورسز فراہم کر رہی ہے اور رہائشی سہولیات بھی فراہم کر رہی ہے تو ایسی ہونی چاہیے جو ان کو Support دے سکے جیسے یہاں ہوم سائنس نہیں ہے۔ Dietician کا Subject نہیں ہے۔ اس طرح اور بہت سے کورسز ہیں۔ ہماری کوشش یہ سب کورسز اور ایسے دوسرے کورس کھولنے کی ہے جو لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ میں نہیں سمجھتی کہ لڑکی ہوم سائنس اس لیے پڑھے کہ وہ صرف اپنا گھر اچھا رکھے بلکہ میرا ماننا تو یہ ہے کہ ہوم سائنس سے جڑی بہت ساری نوکریاں ہیں۔ جب وہ یہاں سے پڑھ کر نکلیں گی تو وہ کام کر سکیں اپنی فیملی کو سپورٹ کر سکے۔ اپنے بچوں کو سپورٹ کرنے کے ساتھ ان کو اچھی غذا دے سکے۔ اگر وہ Dietician کر رہی ہیں تو آپ ہر ہسپتال میں دیکھیں گے کہ بہت سی لڑکیاں ہیں جو اس کام میں لگی ہیں۔

سوال: جامعہ نے کن بین الاقوامی یونیورسٹیوں سے تعلیمی نوعیت کے معاہدے کیے ہیں اور اس سے جامعہ کو کس حد تک فائدہ پہنچنے کی امید ہے؟

جواب: بہت سی یونیورسٹیوں سے معاہدے کیے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ میرے آنے کے بعد ہوئے ہیں۔ یہ پہلے سے کام کر رہے ہیں اور بہت ساری یونیورسٹیوں سے معاہدے بھی کر رکھے تھے یا کچھ ایسے ہوتے ہیں جو Alive نہیں ہوتے، ان کو ہم کر کے بھول جاتے ہیں۔ میری کوشش یہ ہے کہ جتنے بھی معاہدے کیے ہیں اور آئندہ مستقبل میں کریں گے وہ سب Alive رہیں گے اور اس میں ہمارے ٹیچرس تو جائیں ہی ساتھ میں وہاں سے ٹیچرس یہاں آئیں تو ہمارے بچوں کو وہ Exposure دیں جو دوسرے ممالک میں جا کر ان کو ملتا ہے اور ساتھ میں ہمارے بچے بھی جائیں۔ کتنی اسکالرشپ ہوتی ہیں جو بچوں کو لے جاتی ہیں، چاہے وہ مہینے کے لیے جائیں مگر جب وہ لوٹیں گے تو بہت کچھ سیکھ کر آئیں گے، دیکھ کر

آئیں گے۔ ایسے ہی باہر کے بچے ہمارے بچوں کے ساتھ آ کر پڑھیں۔ ایسے بہت سے طلبا آ بھی رہے ہیں۔ آسٹریلیا کی یونیورسٹی سے آ رہے ہیں جو ہمارے یہاں سے دو سمسٹر پڑھ کر جا رہے ہیں اور جب وہ واپس جاتے ہیں تو یہاں کے سمسٹر کے نمبران کی ڈگری میں جڑتے ہیں۔

سوال: سائنس ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے جامعہ کس منصوبے پر کام کرتا ہے؟

جواب: سبھی منصوبوں پر کام کر رہا ہے۔ ہر طرف سے کر رہا ہے۔ سائنس میں ایک لمٹ نہیں ہے۔ Engineering میں بھی کئی طرح کی ریسرچ ہو رہی ہے اور ان سب کو جامعہ کر رہی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی ہے کہ جامعہ صرف اس لیے نہیں کر رہی ہے کہ جامعہ اپنے پیسوں سے کر رہی ہے بلکہ اس لیے کر رہی ہے کہ ایجنسیاں فنڈ میں جا رہی ہیں جو آپ کے Perposal کو دینے سے پہلے، فنڈ کرنے سے پہلے اس کو بہت اچھی طرح دیکھتی ہے۔ آپ کے Presentation کو دیکھتی ہے۔ اس کے بعد بھی ہمارے ٹیچرس، ہمارے Researcher بہت بڑے بڑے پروجیکٹ لا رہے ہیں۔ ہمیں بہت ناز ہے ان پر۔

سوال: جامعہ کی اپنی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اس میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ تمام مذاہب کے طلبا اور طالبات یہاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور بغیر کسی تفریق کے مشترکہ طور پر کیمپس میں رہتے ہیں تو کیا اب تک جو ہندوستانی مذاہب کے طلبا اور طالبات یہاں سے پڑھ کر جا چکے ہیں ان سے ہندوستان میں امن اور مفاہمت کو بنائے رکھنے کے لیے جامعہ کی طرف سے کسی رابطے کا منصوبہ ہے؟

جواب: جو یہاں آ رہے ہیں وہ نہ صرف ہر مذہب کے ہیں بلکہ ہر Direction سے بھی آ رہے ہیں کیونکہ ہمارا داخلہ ٹیسٹ یہاں صرف دہلی میں ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کیرلا اور کشمیر میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہم لوگ بہت جگہ سے کرتے ہیں تاکہ وہاں کا طالب علم پڑھائی میں تیز ہو وہ ہمارے یہاں آ کر پڑھے اور اسی لیے اگر آپ دیکھیں ہماری لسٹ میں تو بہت سارے اسٹیٹ کے بچے یہاں پڑھ رہے ہیں اور ہر طرح کے مذہب کے پڑھ رہے ہیں۔ کسی کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ جامعہ سے پڑھے ہوئے جو بچے نکلتے ہیں وہ اس تفریق کو بھی بھول رہے ہیں اور بہت سے کام ملک کے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے کر رہے ہیں۔

سوال: جامعہ کے قارئین سے آپ کیا تعاون چاہتی ہیں؟

جواب: یہاں پر Alumni سیکشن تو بنے ہوئے ہیں اور Old Boys & Old Girls ان کی سب فہرست سازی تو ہوئی ہے پر Aggressively ان کو ہم ابھی بلا نہیں رہے ہیں۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم اگلے سال جو ہمارا صد سالہ ہے، اس میں ایک بڑا پروگرام کریں جس میں دور دور سے ہمارے جو سابق طلبا ہیں وہ سب یہاں آئیں اور ان میں جو بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ان کو ہم عزت بھی دیں اور ایوارڈ سے بھی نوازیں اور ان کو بتائیں کہ جامعہ کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کو بھی کچھ ادائیگی کرنی ہے۔ مجھے ان سے بہت امیدیں ہیں۔ ہر اچھی یونیورسٹی کے اندر جو ایلیمنائے ڈپارٹمنٹ ہوتا ہے وہ بہت Active ہوتا ہے اور بہت کچھ جو ہمارے کامیاب ایلیمنائے ہوتے ہیں وہ دے رہے ہوتے ہیں۔

"آپ دیکھیں ہماری لسٹ میں تو بہت سارے اسٹیٹ کے بچے یہاں پڑھ رہے ہیں اور ہر طرح کے مذہب کے پڑھ رہے ہیں۔ کسی کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ جامعہ سے پڑھے ہوئے جو بچے نکلتے ہیں وہ اس تفریق کو بھی بھول رہے ہیں"

سوال: اس وقت جامعہ کا بجٹ کتنا ہے؟ اور کیا حکومت اس میں مزید اضافہ کرنا چاہتی ہے؟

جواب: بجٹ کے بارے میں تفصیل تو مجھے یاد نہیں ہے اور یاد ہونا بھی نہیں چاہیے۔ لانے کی بات ہونی چاہیے کہ کہاں سے اور بڑھا رہے ہیں۔ کیونکہ بجٹ تو سب جگہ ہے لیکن آج کل تھوڑا سا بجٹ Cut across the country ہو رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپ اپنا پیسہ خود کمائیے تو یہ ایک اچھی سوچ ہے۔ میرے خیال سے یہ بُری سوچ نہیں ہے۔ اسکول ریڈنگ سے ہمیں عادت پڑی ہوئی تھی کہ اتنا پیسہ تو ملتا رہتا ہے۔ ہمیں کمانے کی ضرورت نہیں ہے تو آج اس کے لیے ہم نے سوچنا شروع کیا ہے۔ کمانے کے لیے کوششیں بھی ہو رہی ہیں اور بہت ساری چیزیں ہیں۔ ایک تو ہم لوگوں کا ریسرچ میں بہت پیسہ آ رہا ہے۔ ریسرچ میں ہمارے جتنے پروجیکٹ ہیں، منظور ہو رہے ہیں۔ ان کی فنڈنگ بھی آ رہی ہیں۔ غیر ممالک کے طالب علموں سے بھی فنڈنگ آ رہی ہے۔ کیونکہ ان کی فیس بھی الگ ہوتی ہے۔ اگر آپ دوسرے ملک میں جائیں تو آپ سے بھی الگ فیس لی جاتی ہے اور ایلیمنی کے ذریعے بھی اپنے اپنے اختراعی پروگرام بھی

ہیں جس میں ہمارے یہاں کچھ Innovation کرکے اور بچوں کی حوصلہ افزائی کرکے سکھایا جارہا ہے کہ وہ کس طرح آگے بڑھ کر کام کریں۔

سوال: ہندوستان کی ضرورت کے اعتبار سے اور جدید تقاضوں کے پیش نظر جامعہ میں اور کون سے نئے کورسز آنے والے ہیں؟ اس سلسلے میں آپ کی کیا کوششیں ہیں؟

جواب: ابھی ہمارے وزیراعظم نے کہا ہے کہ 75 نئے میڈیکل کالج کھولے جائیں گے کیونکہ ہندوستان میں ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے تو جامعہ نے سب سے پہلے اپنا مطالبہ کیا ہے کہ ہم بھی میڈیکل کالج کھولنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ڈینٹل کالج ہے، پیرا میڈیکل کالج ہے۔ اس طرح ایک اچھی سوچ شروع ہوئی ہے ایک خواب شروع ہوا ہے۔ اس میں وقت تو لگے گا کیونکہ ہم کالج کے لیے زمینیں لیں گے فنڈنگ لیں گے۔ پھر کالج بننا شروع ہوگا۔ مگر امید ہے کہ ایک دن اور بہت جلد میڈیکل کی عمارت جامعہ میں بن کر کھڑی ہوگی۔

"ابھی ہمارے وزیراعظم نے کہا ہے کہ 75 نئے میڈیکل کالج کھولے جائیں گے کیونکہ ہندوستان میں ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے تو جامعہ نے سب سے پہلے اپنا مطالبہ کیا ہے کہ ہم بھی میڈیکل کالج کھولنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ڈینٹل کالج ہے، پیرا میڈیکل کالج ہے۔ اس طرح ایک اچھی سوچ شروع ہوئی ہے ایک خواب شروع ہوا ہے"

سوال: کیا جامعہ کے اساتذہ کی ایسی نشستیں اور پروگرام ہوتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو کہ اساتذہ علم و تحقیق کے میدان میں نئی Research اور تحقیق کررہے ہیں؟ یا یہ کہ ان کی نئی تحقیقات و تخلیقات کن کن موضوع پر شائع ہو رہی ہیں؟

جواب: ایسے پروگرام تو قریب قریب ہر روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں پر بہت ساری کانفرنس، بہت سارے سیمینار اور بہت ساری بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ہم نے یہاں پر کوئی ریسرچ کی ہے اور دوسروں کو پتا نہیں چلا تو فائدہ کیا ہے۔ اس لیے ہمارے ٹیچرس جو Researcher's ہیں ہمارے یہاں کئی سینٹر ہیں جو صرف ریسرچ کر رہے ہیں ان کے لیے وہاں بھی کام ہو رہا ہے۔ انجینئرنگ میں کانفرنس ہر جگہ ہو رہے ہیں اور اس میں باہر کے لوگوں کو بھی بلاتے ہیں اور ان سے بھی سیکھتے ہیں۔ ان کو بتاتے ہیں کہ جامعہ میں کیا ہو رہا ہے۔ Publication تو بہت اچھا ہے۔ اس وجہ سے نیشنل گریڈنگ NIRF میں جامعہ بارہویں نمبر پر ہے۔ بارہواں نمبر ہونا اس پورے ملک میں بہت بڑی بات ہے۔

سوال: ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے گذشتہ سالوں میں کیا کوئی علمی تحقیقی کام ہوا ہے؟

جواب: ہاں، بالکل ہوا ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے اس میں کانفرنس بھی ہوئی تھی اور بہت سارے کام ہوتے رہتے ہیں۔ اصل میں جتنے بھی سینٹرس ہیں اس طرح کے جیسے یہ سینٹر ایک تو ان سب میں ریسرچ کے علاوہ کچھ کورسز بھی ہوتے ہیں مگر خاص ریسرچ اور کانفرنس ہے۔

سوال: کیا جامعہ کا شعبۂ اسلامک اسٹڈیز عصر حاضر کے نئے مسائل پر ریسرچ کراتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق اس نے اب تک کیا کیا ہے؟

جواب: بہتر ہے کہ یہ معلومات آپ اسی شعبے سے لیں۔ یہ باتیں شعبہ ہی بتائے گا۔ لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ابھی ایک مہینہ پہلے اس شعبے میں ایک بہت اچھی کانفرنس ہوئی تھی۔ دور دور سے لوگ آئے تھے۔ ساؤتھ افریقہ تک سے لوگ آئے تھے اور بہت اچھے موضوع پر باتیں ہوئی تھیں۔ یہ کانفرنس بین الاقوامی تھی۔ یہ شعبہ بہت فعال ہے۔

سوال: مسلم طلبا و طالبات اور خواتین کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟

جواب: دیکھیے یہ یونیورسٹی تو اقلیتی یونیورسٹی ہے۔ اس میں فوقیت ہے مسلم کی مگر اس برتری کے سہارے مت رہیے کیونکہ ایک دن آپ کو باہر بھی نکلنا ہے۔ اس لیے یہاں کے بچوں سے کہہ رہی ہوں کہ یہاں آپ آسانی سے آجاتے ہیں اور یہاں اچھا ماحول ہے اور بہت کچھ سیکھتے ہیں مگر ساتھ میں یہ بھی ہے کہ آپ کو اور آگے جانا ہے اس لیے اس کے لیے تیاری کریے اور مجھے یقین ہے کہ بہت اچھا کریں گے۔ ہمارے یہاں کے طالب علم باہر نکل کر کافی اچھا کر رہے ہیں اور شروعات بھی ہو رہی ہے۔ بچے یہاں پر صرف پڑھنے نہیں آئے ہیں بلکہ بہت اچھی Research بھی کرنے آئے ہیں۔ اس کے لیے ان کی بہت عزت ہوگی آنے والے وقت میں۔ یہ نوجوان نسل اگر تعلیم یافتہ ہے تو یہی چلائے گی دیش بھی دنیا بھی۔

□□□

Zaibun Nisa
A-1, 4th Floor, M.M. Apartment
Okhla Vihar, Jamia Nagar
New Delhi-110025

شاعرات کے منتخب اشعار

حدِ نظر سے آگے اک شعلگی کا موسم
خواب و گماں شکستہ ہر اک خیال زخمی

کیا دن تھے بہاروں کی قبا کھول رہے تھے
آنچل میں مرے قوس وقزح گھول رہے تھے

صغریٰ عالم

سطحِ دل پر ہے کسی یاد کا پرتو ایسے
جیسے شیشے پہ چمکتی ہوئی بارش کی بوند

مشعل بدست کوئی مرے ساتھ چل پڑا
تاریک وادیوں سے مرا جب گزر ہوا

حسنیٰ سرور

ہم جسے سمجھے تھے پانی ریت تھی
تشنگی! پھر کھا گئی دھوکا نظر

دہشت زدہ زمین پر وحشت بھرے مکاں
اس شہرِ بے اماں کا آخر کوئی خدا ہے

بلقیس ظفیر الحسن

وطن کی یاد سرِ شام ہجر جب آئی
ابھرتا چاند بھی نوحہ کناں نظر آیا

ہزار ترکِ وطن کا تھا مرحلہ درپیش
مری نظر میں رہا نیم وا کوئی در بھی

عرفانہ عزیز

در و دیوار پر پرچھائیاں آتی تھیں نظر
بات کرنے کو بھی ترسی ہوں سحر ہونے تک

پربتوں کی اوٹ میں اک جھیل ہے سوکھی ہوئی
پیاس بھی ان پتھروں کی اب پرانی ہو گئی

مریم غزالہ

ہم کہ خود ساختہ زنجیروں کے دیرینہ اسیر
درِ زنداں بھی کھلا پائیں تو جائیں گے کہاں

مدت گزری اک حرفِ طلب ہونٹوں پر آ کے ٹھہر گیا
تم سن نہ سکے ہم کہہ نہ سکے، اس بات کو اب دہرائیں کیا

ناہید اختر

قاتل وہی ہوا ہے وصیہ نصیب سے
جس کا کبھی شمار مرے چارہ گر میں تھا

جیسے مرا وجود ہی باقی نہ ہو کہیں
کچھ اس طرح سے اس نے فراموش کر دیا

فاطمہ وصیہ جائسی

اسیر ہو ہی گئیں تہمتوں کے جنگل میں
کہیں تو آ کے ٹھہرتیں بغاوتیں میری

نہ جانے کب کسی دیوار میں چنی جاؤں
ہیں انتظار میں کب سے جسارتیں میری

رفیعہ شبنم عابدی

ڈاکٹر کائنات انصاری

جدیدیت کی تحریک
ایک جائزہ

جس دور میں جدید افسانے کی ابتدا ہوئی اس وقت ہمارا ملک دوسری جنگِ عظیم اور تقسیم ہند کے سانحے سے دو چار ہو چکا تھا اور اس کے نتائج میں درپیش آنے والے فسادات اور ہجرت نے اس عہد کے افسانہ نگاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس طرح ہندوستانی سماج ایک نئی کروٹ لے رہا تھا جس کے سبب ہمارے نئے فنکاروں کا ذہن اپنے پیش رو فنکاروں کے ذہن کے بالکل مخالف چل رہا تھا کیوں کہ نئے افسانہ نگاروں کا ذہن اس طرح مطمئن نہیں تھا جس طرح سے اس سے پہلے کے افسانہ نگاروں کا تھا۔ یہ نئے فنکار غلامی کی زنجیروں سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے۔ بٹوارے اور فسادات کی کسک ان کے دلوں میں اک ہوک سی پیدا کیے ہوئی تھی۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے انتشار سے اس کا جی اوب چکا تھا اور جس طرح سے ملک سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیوں سے نبرد آزما ہو رہا تھا اور صنعتی تہذیب کی حشر سامانی سے مایوس ہو کر جس طرح سے یاسیت کی طرف بڑھ رہا تھا ان سب حالات سے دنیا اور دنیا کے ادیب و ادب کیسے متاثر نہ ہوتے۔ وہ بھی سماج کی ان تمام تر تبدیلیوں کو محسوس کر رہے تھے۔

یہ دنیا کا ازلی دستور ہے کہ جب قدیم روایت اپنا وجود کھونے لگتی ہے تو نئی روایت یا نئی تہذیب اس کی جگہ لینا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس تبدیلی کے قدموں کی چاپ ادب میں بھی آہستہ آہستہ سنائی دے رہی تھی اور اردو ادب کی تمام اصناف کے ساتھ ہی ساتھ اردو افسانے کا منظرنامہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئے اور الگ نوعیت میں قاری کے سامنے حاضر ہو گیا جسے جدید افسانے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اگر چہ اس کی بازگشت بہت پہلے سے ادب میں سنائی دینے لگی تھی لیکن اس کے خدو خال 1955 کے آس پاس واضح ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور 1960 تک آتے آتے اس نے ایک مستحکم تحریک کی شکل اختیار کر لی جس کو اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس تحریک کے افسانہ نگار جدید ذہن کے حامی تھے اس لیے انھوں نے قدیم یا پرانی روش پر چلنا گوارا نہیں کیا اور افسانے کے پودے کے لیے نئی زمین تلاش کی جس پر مختلف زاویے سے انھوں نے اس زمین پر مختصر افسانے کی نئی بنیاد رکھی اور یہیں سے نئے افسانے کی شروعات ہوگئی جس پر کئی طرح کے تجربات کیے گئے۔

جدیدیت کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور فوراً دل و دماغ اس تحریک یا رجحان کی طرف مڑ جاتا ہے جو ترقی پسند تحریک کے برعکس وجود میں آئی تھی۔ جب بھی اردو ادب میں جدیدیت پر بات ہوتی ہے تو ہمارا ذہن فوراً پرانی روایت کے ادب سے گریز کرنے والی، اپنی دنیا میں گم رہنے والی، خارجی سے داخلی کی طرف سفر کرنے والی

اور افراد سے فرد کی طرف رجوع کرنے والی تحریک کی طرف جا بجا چلا ہی جاتا ہے۔ یعنی ہمارا ذہن فوراً اس خیال کی طرف مڑ جاتا ہے کہ جدیدیت کی تحریک ترقی پسند تحریک کے خلاف وجود میں آئی ہے۔ جدیدیت کی تحریک کا ترقی پسند تحریک کے مرّوجہ اصولوں اور نظریوں سے بغاوت کی اصل وجہ اس کے اندر پیدا ہونے والا جمود ہے اور آنے والی نئی نسل یا نیا ادیب ترقی پسند تحریک کے اس جمود سے بالکل اکتا گیا تھا۔ جس کے سبب وہ گذشتہ روایت سے بالکل الگ کٹ سا گیا تھا۔ قدیم مروجہ اقدار کی نفی اور ہر قسم کی سماجی و اخلاقی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے انحراف اس کا مقصد ٹھہرا کیوں کہ سماج میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ لوگ سماجی، سیاسی، معاشی اور قدیم اقدار و عقائد کی شکست و ریخت سے پریشان ہو چکے تھے۔ نئے لکھنے والے ایک طرح سے فکری انتشار، ذہنی کشمکش اور افسردگی سے دوچار تھے اور اس نئی نسل کو اس کی افسردگی و بیچارگی سے نکالنے والا کوئی نہیں تھا جس کے سبب نئے لکھنے والوں نے اپنے پرانے لکھنے والوں سے بیزاری اختیار کر لی اور اجتماعی زندگی سے انفرادی زندگی کی طرف آ گئے جہاں انھوں نے خود کی ذات کے حصار میں قید ہو کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنا شروع کر دی۔

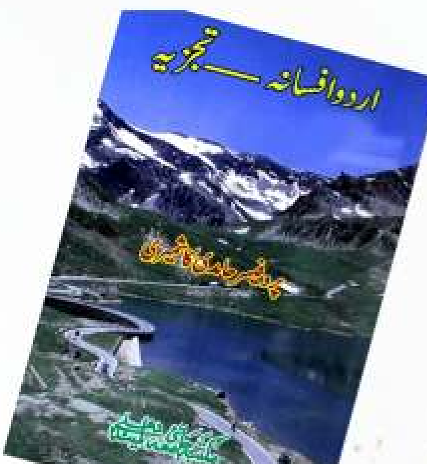

پروفیسر حامدی کاشمیری کا بھی یہی خیال ہے کہ جب ترقی پسند تحریک اپنے ہی دائرے پر گھومنے لگی اور اس کے پاس کوئی نئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی تو اس پر جمود طاری ہونے لگا۔ لکھتے ہیں:

"1960 کے بعد مارکسیت کے روبہ زوال ہونے کے نتیجے میں حقیقت نگاری کی روایت تیزی سے اپنا اثر و اقتدار کھونے لگی، اور جدیدیت کا رجحان پورے طمطراق کے ساتھ فروغ پانے لگا، اور تیزی سے نئے افسانہ نگاروں کے رویوں پر اثر انداز ہوا۔ یہ رجحان کچھ تو مارکسیت کے خلاف ردِعمل کے طور پر اور کچھ جدید معاشرتی اور کائناتی آگہی کے طور پر پنپنے لگا۔ اس کے نتیجے میں اجتماعیت کے مقابلے میں فردیت اور خارجیت کے مقابلے میں داخلیت کے علاوہ روایت شکنی، تجربہ پسندی اور جدت طرازی کے رویوں کو فروغ ملا، چنانچہ افسانوں میں شناخت کے بحران، معاشرتی پراگندگی، اجنبیت اور تنہائی کے تجربوں کو جگہ ملی اور راست بیانی کے بجائے علامت نگاری اور تجریدیت کو اہمیت دی جانے لگی"۔ (اردو افسانہ۔ تجزیہ: پروفیسر حامدی کاشمیری: ص:8۔6)

ان دانشوروں کے خیالات و نظریات کا محاسبہ کرنے کے بعد یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی ضروری ہے، کیوں کہ تبدیلی ہی اپنے وجود کے نامیاتی ہونے کی پہچان ہے اور ترقی کی منزل کی پہلی سیڑھی جو بھی وقت و حالات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے وہی آخر تک اپنی پہچان قائم رکھ سکتا ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ افسانے نے بھی وقت و حالات کے ساتھ خود کو تبدیل کیا اور زمانے کے ساتھ چل کر اپنی ایک نئی پہچان بنائی۔ جدیدیت کا وجود میں آنا ترقی پسند تحریک کے ردِعمل میں ظاہر ہوا ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی کی ایک اور بات ذہن میں رکھنا چاہیے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ:

"یہ معاملہ صرف پلاٹ، کردار، علامت یا تجربہ، سماجی معنویت اور سیاسی شعور کا نہیں۔ جب تک یہ بات پوری طرح نہ واضح ہو کہ نئے افسانہ نگاروں نے کن چیزوں سے اپنا رشتہ توڑا ہے اور کیوں، اس وقت تک نئے افسانے کی تنقید ممکن نہیں"۔

(افسانے کی حمایت، شمس الرحمٰن فاروقی: ص:146)

اردو افسانہ جب تک حقیقت نگاری، بیانیہ اور روایتی انداز پر چلتا رہا، تو ترقی پسند افسانہ کہلایا، لیکن جب وقت و حالات بدلے اور زندگی گزارنے کا طریقہ بدلا تو افسانہ بھی اک نئے روپ میں ظاہر ہونے لگا اور اب اس کی پیش کش میں حقیقت نگاری، بیانیہ اور روایتی انداز کی جگہ علامت، تجریدیت، رمز، کنایہ، استعارہ وغیرہ کا استعمال ہونے لگا اور یہی انداز بیان اردو ادب میں جدیدیت کی تحریک کہلائی۔

جدیدیت کے حوالے سے 1960 کے بعد اردو ادب میں اور خاص طور سے افسانے میں جو ایک اہم تبدیلی نظر آئی، وہ موضوعات کی

صورت میں تھی۔ سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے دور میں ان کے افسانوں کے پسندیدہ موضوعات منظر نگاری اور فطرت نگاری تھی جن کے ذریعہ وہ اپنے افسانوں میں ایک رومانوی فضا قائم کرتے تھے اور افسانوں کا اختتام عموماً طربیہ پر ہوتا تھا۔ لیکن جب پریم چند نے افسانوی دنیا میں قدم رکھا تو حقیقت نگاری کا دور شروع ہوا اور ترقی پسند تحریک کے خدوخال نظر آنے لگے۔ اس تحریک کا اصل مقصد حقیقت نگاری کے ذریعہ سماج کے ایک دوسرے رخ کو ظاہر کرنا تھا اس لیے اس کے موضوعات میں وسعت تھی۔ مثلاً مزدوروں اور کسانوں کا استحصال، سرمایہ داروں اور زمینداروں کا جبر، ہندو مسلم فسادات، طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری، عورت کی بے بسی اور مجبوری، ہند و پاک بٹوارہ اور سب سے بڑا مسئلہ ملک کی آزادی اس کے اہم موضوعات تھے جس کا مقصد سماج کے ایک دوسرے رخ کو اور اس کی حقیقت کو بے پردہ کرنا تھا جس پر رومانویت نے ایک خوبصورت چادر ڈال رکھی تھی۔ لیکن 1960 کے بعد اس طرح کے موضوعات پر افسانے لکھنے کا رواج آہستہ آہستہ کم ہونے لگا کیوں کہ آزادی کے چند برسوں کے بعد ہی ملک اور سماج دونوں کے ہی تقاضے بدلنے لگے تھے۔ سماجی، سیاسی اور فکری سطح پر جو بھی تبدیلیاں ہوئیں انھوں نے انسانی زندگی کے تمام نظریات کو بدل کر رکھ دیا جس کا اصل سبب انسان کے سامنے نت نئے درپیش مسائل تھے جس سے وہ روز دوچار ہوتا تھا اور یہ مسائل صرف سماجی و سیاسی سطح پر نہیں تھے بلکہ انسان کی ذہنی و فکری سطح تک بھی پہنچے ہوئے تھے۔ مثلاً اخلاقی اور روحانی قدروں کا زوال، سائنسی اور مشینی دور کا آغاز جس نے ایک طرف تو ترقی کے راستے کھول دیے اور دوسری طرف انسان کی اہمیت کو کم کر دیا جس کے سبب انسان کی خود اپنی شناخت کہیں گم ہوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بھیڑ میں ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو تنہا محسوس کرتا تھا، ہجرت سے اپنی جڑ سے اکھڑ جانے کی کسک نے کہیں نہ کہیں اس کے وجود کو سوالیہ نشان بنا دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی معاشی و معاشرتی مسائل وغیرہ بھی تھے جس نے اس کی ذہنی و فکری سطح کو متاثر کیا جب کہ ان سب حالات سے پہلے اس کی زندگی بتدریج چل رہی تھی۔ ہر شخص کی اپنی پہچان تھی۔ اس کا رشتہ ماضی اور حال دونوں سے وابستہ تھا جس کی وجہ سے زندگی میں اک تسلسل تھا لیکن آہستہ آہستہ اس مشینی دور کے سبب اس کی زندگی میں تیز رفتاری آتی گئی اور جو زندگی بتدریج طے ہو رہی تھی اس میں اچانک تیزی آ گئی اور اس تیز رفتاری نے اس تسلسل کو، اس رابطے کو ختم کر دیا جس کی وجہ سے اس کا رشتہ اس کے ماضی اور حال سے جڑا ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ اس کا رشتہ ان سب چیزوں سے ٹوٹتا چلا گیا۔

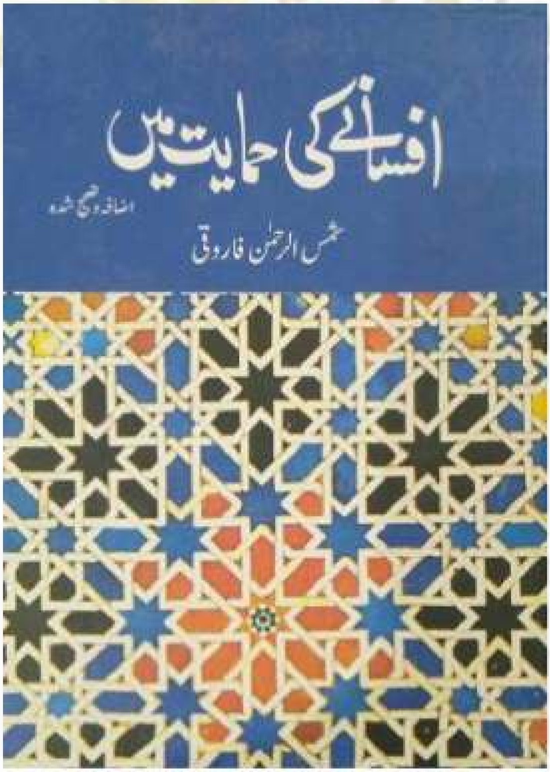

صنعتی ترقی نے اس کے تجربات میں اس قدر تنوع پیدا کیا کہ اس کا ذہن ان سب کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہو گیا۔ لہٰذا وہ اپنے ماضی سے دور ہوتا چلا گیا اور اس طرح صنعتی معاشرے کا انسان خود ہی اپنی پہچان سے دور ہو گیا اور جب اس کو احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس طرح اپنی پہچان کھو دینا، اس کی فردیت کا گم ہو جانا اس دور یا اس معاشرے کے انسان کا وہ المیہ ہے جو اس کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔

شناخت کے گم ہو جانے کے اس المیے نے جدید افسانہ نگاروں کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا جس کو انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس مسئلے کو اپنے افسانوں کا ایک اہم موضوع بنایا۔ لیکن ان موضوعات کو براہِ راست پیش نہ کر کے اشاروں کنایوں کے ذریعہ مبہم طریقے سے پیش کیا جس کو علامتی یا تجریدی افسانے کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ظاہری بات ہے علامتی افسانے اس دور میں صرف اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ اگرچہ وقت و حالات کے ساتھ، نئی تہذیب و تمدن کے ساتھ اس وسیلے کی شکلیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ علامت کے ذریعہ تخلیق کار اپنے فن کے ذریعہ اپنے تخلیق کو تہہ دار اور مبہم بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے فن میں گہری معنویت کے ذریعہ اپنے قاری کے درمیان ایک طرح کی دھند بھی چھوڑتا جاتا ہے۔ لیکن ان علامتوں کے ذریعہ وہ قاری تک اپنا مقصد

براہِ راست نہ پہنچا کر اشاروں کنایوں کے ذریعہ پہنچاتا ہے۔ علامت کیا ہے؟ اس پر ڈاکٹر شفیق انجم بحث کرتے ہوئے اپنے مضمون ''علامت، علامتی تحریک اور اردو افسانے کا دورِ اولین'' میں لکھتے ہیں:

''علامت اظہار کا ایک وسیلہ ہے۔ اس وسیلے سے انسان ابتدائے آفرینش ہی سے کام لیتا رہا ہے۔ بعد میں جوں جوں تمدن کی بنیاد پڑی اور انسان مختلف حالات و ماحول سے دوچار ہوا تو اس وسیلے کی شکلیں بھی تبدیل ہوتی گئیں۔ فطرت کے طبیعی و غیر طبیعی عناصر اور انسان کی بصیرت و بصارت باہم مل کر علامتوں کی تشکیل کا باعث بنے۔ چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے، ان کے معانی متعین کرنے اور نسل در نسل مختلف تہذیبوں میں ان کی منتقلی علامتوں کی ایجاد کا محرک بھی بنی اور ان میں تغیر و تبدیلی کا بھی۔ علامت اپنی ماہیت کے اعتبار سے شے، جسم یا چیز نہیں بلکہ یہ اشیاء و اجسام کی نمائندہ ہے۔ ظاہری سطح پر بھی اور باطنی سطح پر بھی''۔

(سہ ماہی روشنائی: (اپریل تا جون 201ء): ص:48)

علامت نگاری حقیقت نگاری کے بالکل برعکس ہوتی ہے جس میں بڑی ہی تہہ داری کے ساتھ کسی مسئلے کو پیش کیا جاتا ہے جن میں کئی بڑے معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بعض دفع تو افسانے کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اس کی وضاحت کرنے والے اشاروں کو بھی سمجھنا پڑتا ہے جو کہ خاصہ ریاضت طلب امر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اردو کی افسانوی فضا پر علامت نگاری کا رجحان عام ہوا تو ترقی پسند تحریک سے وابستہ کئی افسانہ نگاروں نے اس پر اعتراض کیا، کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ادیبوں کو ایسا ادب تخلیق کرنا چاہیے جو با آسانی قاری کی سمجھ میں آ جائے اور جس کو سمجھنے کے لیے قاری کو بہت زیادہ غور و فکر کرنے کی جدوجہد نہ کرنی پڑے اور اس کا ذہن با آسانی مسئلے کی طرف فوراً رجوع کر جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ افسانے کی تشریح میں ہی الجھ کر رہ جائے اور اصل مقصد تک رسائی حاصل کرنا اس کے لیے ٹیڑھی کھیر ہو جائے۔

جدیدیت کیا ہے اگر یہ سوال کیا جائے تو فوراً ہمارے ذہن میں خیال آئے گا کہ ''نیا اور اچھوتا''۔ جو بھی ہوگا اسے جدیدیت کہیں گے پھر وہ نئی تبدیلی زندگی میں پیش آئے یا ادب کے میدان میں۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جدیدیت کا وجود میں آنا صرف اپنے دور کا اور اپنی روایت سے رو گردانی کرنے کے عمل میں درپیش نہیں آیا ہے اور نہ ہی یہ صرف مغرب کی نقالی ہے بلکہ ہر ادب، ہر تحریک یا ہر انقلاب کے وجود میں آنے کی کئی وجوہات ہیں۔ جو تخلیق جو اپنے عصری تقاضوں کا ساتھ دیتی ہے وہ جدید کہلاتی ہے۔ جب زمانہ بدلتا ہے اس کی قدریں بدلتی ہیں اس کا مزاج و معیار بدلتا ہے تو اس کے حسب حال جو ادب یا تخلیق ہوگی وہی نئی ہوگی اور وہی جدید کہلائے گی۔ جس وقت جدیدیت کی تحریک وجود میں آئی اس کے وجود میں آنے کے کئی پس منظر تھے۔ ملک دو جنگِ عظیم سے دوچار ہوا تھا۔ سائنس کے ایجاد و انکشافات نے صنعتی ترقی کے راستے وا کر دیے اور ملک میں صنعتی دور کا بڑی تیزی سے آغاز ہو چکا تھا، لیکن دوسری طرف انسان کی معصومیت کا زوال بھی ہونے لگا تھا۔ صنعتی ترقی کے سبب انسان معاشی بدحالی، خود غرضی، منافع خوری اور محبت کی کمی جیسے جذبات سے دوچار ہونے لگا تھا اور ان سب کی وجہ سے انسان انسان سے دوری محسوس کر رہا تھا۔ مادّی ترقی تو انسان کر رہا تھا لیکن روحانی خوبیوں سے دن بہ دن خالی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی ہی ذات میں کہیں گم ہو رہا تھا۔ اس خلا کو اس دور کے مفکر و فنکاروں نے عوام کے مقابلے میں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ دنیا کی سیاست نے انسان اور انسانیت کے زوال کا باب وا کیا تو اس دور کے فنکاروں نے مل کر انسانیت کی بقا کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور اس طرح ادب میں جذبات و احساسات کے بیان کو زیادہ اہمیت دی۔ بقول ڈاکٹر سرفراز جاوید:

'اسلوبیاتی اور تکنیکی اعتبار سے جدیدیت کی نمایاں خوبیاں علامت نگاری، تجریدیت، علامتی کردار، اینٹی ہیرو رجحان، پلاٹ سے بیزاری یا پیچیدہ اور مرکب پلاٹ، امیجز، استعارے، تمثیل، اسطور، دیومالا، نثر اور شاعری کی ٹوٹتی حد بندیاں، کلیدی، الفاظ کی تکرار، ماضی، حال اور مستقبل کی ملتی سرحدیں وغیرہ قرار پائیں گی۔ موضوع کے لحاظ سے جدیدیت، مشینی اور صنعتی نظام کی ہنگامہ خیزی، مذہب اور ماورائیت کے خلاف بغاوت، پرانی اقدار کے انہدام اور نئی قدروں کی تعمیر، اقدار کے اضافی ہونے میں یقین، اجنبیت، بیگانگی، بے سمتی، مہملیت، تنہائی، بے چہرگی، کرب و سوسہ، تشکیک، اپنی ذات سے حتمی وابستگی، معتبر اور مستند وجود کی جستجو، ٹوٹتے، بکھرتے رشتے، لمحوں کی گرفت میں لینے کی کوشش، اجتماعیت سے انحراف، داخلیت کا بکھراؤ، جذباتی اور فکری آسودگی، آزادانہ زندگی جیسے کی خواہش، ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی تمنا وغیرہ سے عبارت ہے''۔

(افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ: (دہلی کے حوالے سے) ڈاکٹر سرفراز جاوید: ص:200)

ہر دور میں افسانہ اپنے فن، اسلوب، آرٹ اور موضوع سے پہچانا جاتا ہے اور اس کا رشتہ قاری سے تبھی قائم ہوتا ہے جب وہ اپنے عہد و

ماحول کی ترجمانی کرتا ہے ساتھ ہی اس میں فکر وفن کا امتزاج بھی ہو۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ہمیں مختلف تجربات ملتے ہیں شاید اسی لیے اردو افسانہ ہر دور میں نئے نئے تجربات سے گزرتا رہتا ہے۔ یہ تجربات کبھی تکنیک کے لحاظ سے ہوتے ہیں تو کبھی مواد، موضوع اور معنی کے اعتبار سے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے پریم چند سے لے کر اب تک، یعنی جدید دور کے جدید افسانوں تک میں ہمیں افسانے کے فن، موضوع، تکنیک اور مواد پر کئی طرح کے تجربات مل جائیں گے۔ اس وقت اردو ادب کے افسانوی ادب میں علامتی، تجریدی، تمثیلی اور استعاراتی افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ خصوصاً علامتی اور تجریدی طرز کے افسانوں کو خاص رواج حاصل ہو رہا ہے۔ جس کے سبب ہمیں 1960 کے بعد کلاسیکی انداز کے افسانے کم ہی ملتے ہیں لیکن جدید انداز کے افسانوں کی ایک جھلک ہمیں ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں مل جائے گی۔ ان افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، ممتاز مفتی، منٹو، سجاد ظہیر اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے کئی ایسے افسانے ہمیں مل جائیں گے جو کبھی اینٹی پلاٹ افسانہ ہیں تو کبھی کردار نگاری کی بنیاد پر لکھا گیا افسانہ، کبھی شعور کی رو میں لکھا گیا افسانہ، تو کبھی ڈرامائی صفت سے بھرپور افسانہ محسوس ہوگا۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں میں خاص طور سے کرشن چندر نے علامتی افسانے لکھے ہیں۔ انھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں ہیئت اور تکنیک کے ساتھ تجربات کیے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ انداز کسی بھی طرح کا کوئی خاص رجحان نہیں بن سکا لیکن 1950 کے بعد اردو افسانے میں اچانک کئی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اور 1960 تک آتے آتے افسانوں میں علامتی اور تجریدی افسانوں کا رواج عام ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک رجحان کی شکل اختیار کر لی۔

ترقی پسند تحریک کے افسانوں سے جدید افسانے صرف مواد و موضوع کے اعتبار سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے بھی بالکل مختلف ہیں۔ اس کی خاص وجہ دونوں کے ادیبوں کا زندگی اور ادب کو دیکھنے کا مختلف نظریہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کا عہد جن مسائل سے دوچار تھا جدید دور ان مسائل سے ناآشنا تھا جدید دور کے افسانہ نگاروں نے جب لکھنا شروع کیا تھا تو ہر جانب سیاسی اور ادبی سطح پر انتشار پھیلا ہوا تھا۔ سماج کا دانشور طبقہ شدید ذہنی کرب اور انتشار میں مبتلا تھا۔ اس وقت کے ادب میں جو بھی آئیڈیلزم اور عقائد تھے سب خاک میں ملتے جا رہے تھے اور اقدار و عقائد کی شکست و ریخت نے اخلاقی سطح اور مساوات کے خیال کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس لیے ترقی پسند افسانوں میں اور جدیدیت کے افسانوں میں خاصہ فرق ہے اور یہ فرق صرف افسانویت کی سطح پر نہیں ہے بلکہ ہیئت، موضوع اور مواد کی سطح تک پھیلا ہوا ہے۔

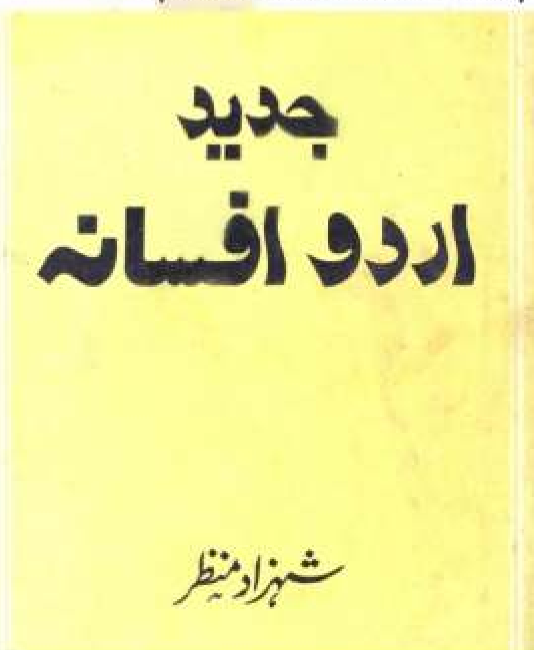

ڈاکٹر شہزاد منظر لکھتے ہیں:

"ترقی پسندوں کے ہاں پورے معاشرے کو دیکھنے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا انداز اجتماعی تھا اسی لیے وہ معاشرے میں ادب کے ذریعہ فکری انقلاب لانے پر یقین رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اظہار کا جو طریقہ اختیار کیا وہ قاری سے براہ راست تخاطب تھا۔ چنانچہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے علامتی طرز اظہار کے مقابلے میں وضاحتی طرز بیان کو ترجیح دی۔ اس کے برعکس جدید افسانہ نگاروں کا زندگی اور اس کے مسائل کو سمجھنے اور اسے پرکھنے کا انداز انفرادی تھا۔ اس لیے انھوں نے صنعتی دور کے انسان کی معاشی بدحالی اور سماجی پس ماندگی کے مقابلہ میں اس کی فکری اور جذباتی ناآسودگی، انسان کی داخلی شخصیت کے بکھراؤ، اقدار کی شکست و ریخت، صنعتی معاشرے میں انسان کی تنہائی نیز زندگی کی معنویت اور ذات کی تلاش جیسے موضوعات کو اہمیت دی اور اس کے اظہار کے لیے انھوں نے بیانیہ اسلوب کے بجائے علامتی طرز اظہار کو اپنایا"۔

(جدید اردو افسانہ، ڈاکٹر شہزاد منظر: ص: 48-47)

بدلتے ہوئے وقت اور حالات نے نئے ذہن کے نوجوانوں کو پرانے طرز کی کہانیوں سے اکتا دیا تھا۔ کچھ نے بدلتے ہوئے وقت و حالات کے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا اور جدید کہانی کی طرف صرف فیشن کے طور پر آ گئے تا کہ اپنی ایک الگ روش بنا سکے تو کچھ جنریشن گیپ (نسلی خلا) تھا جو قدیم و جدید دور کے درمیان ذہنی وفکری سطح تک پہنچ چکا تھا تو کچھ کے پاس وجودیت کا کرب اور تنہائی کا احساس تھا، تو کچھ بدلتے ہوئے سماج کے نظام کی روایتیں تھیں جو نوجوان طبقے کے ذہن کو جھنجھوڑ رہیں تھیں۔ کچھ فنکارانہ ذہن کسی دوسری دنیا کی تخلیق میں کوشاں تھے اور انھوں نے اپنے طور سے ایک الگ طریقے کی کہانیوں کو وجود میں لانے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کیا اور اس طرح 1955 سے 1970 کے درمیان جدیدیت کی تحریک نے پورے طور سے اپنا قبضہ ادب پر جما لیا۔

تغیرات زمانہ ایک ایسا عمل ہے جس کے زیر اثر بڑی بڑی تحریکیں اور بڑے بڑے لوگ زمانے کی نذر ہو گئے یعنی 'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'۔ اس تغیرات نے صرف ہستیوں کو نہیں مٹایا بلکہ ادب بھی اس سے بچ نہیں سکا۔ ادب میں بھی صرف موضوع و مواد نہیں بدلے بلکہ ہیئیت اور اسلوب بھی بدلتے گئے اور چونکہ جدید افسانے علامتی اور تجریدی پیرائے میں ہوتے تھے اس لیے اس کو سمجھنا قاری کے لیے ایک معمہ تھا۔ قاری کے سامنے افسانے کی ترسیل وابلاغ کا مسئلہ تھا اور افسانہ بیشتر قاری کے لیے ایک مبہم سی پہیلی بن کر رہ گیا۔ شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> ''جدیدیت ایک انتہائی مبہم، غیر واضح اور گمراہ کن اصطلاح ہے جس کی وجہ سے شعر و ادب میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جدیدیت سے مختلف لوگ مختلف مفہوم لیتے ہیں۔ جدیدیت کے بارے میں اتنے بحث ومباحثہ کے بعد بھی اس کی کوئی واضح اور متعین تعریف مقرر نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدیدیت کسی ایک ادبی رجحان کا نام نہیں بلکہ ایک سے زائد رجحانات کا نام ہے۔ اسی لیے بعض لوگ جدیدیت کو تحریک یا رجحان کے بجائے اظہار خیال کا ایک مخصوص اور اچھوتا انداز قرار دیتے ہیں''۔

(جدید اردو افسانہ: ص:44)

اگرچہ اس کے باوجود نئی نسل نے بڑی تیزی کے ساتھ اس رجحان کی طرف رجوع کیا کیوں کہ علامتوں میں بات کہنا آسان تھا۔ ہاں ادب کی تخلیق کا کوئی واضح پیمانہ نہیں تھا۔ بے ربطی باتوں سے افسانہ شروع ہوتا اور پلاٹ و کردار یا قصے وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جس کے سبب افسانوی ادب میں ایک طرح سے بھیڑ چال شروع ہوگئی تھی۔

اس طرح کے رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1970 کے بعد ابھرنے والی نئی نسل نے جلدی شہرت ومقبولیت حاصل کرنے کے لیے اپنے پیش رو افسانہ نگاروں کے تجریدی، تمثیلی، علامتی اور استعاراتی افسانوں کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے اور بھٹکنے لگے، لیکن اس نسل کو جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ اس طرح کے افسانوں سے ان کا وجود خطرے میں آ جائے گا اور قاری سے ان کا رشتہ ٹوٹ جائے گا اور اس طرح ان کی خود اپنی شناخت کہیں گم ہو جائے گی یا خطرے میں پڑ جائے گی۔

ان تمام باتوں کا محاکمہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج ہو یا ادب اس میں تبدیلی آنا ایک فطری عمل ہے۔ اس کی تبدیلی میں، حرکت میں، اضطراب میں ہی اس کی بقاء اور نموئیت کے آثار پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر دور میں سماج کے لحاظ سے اس کا ادب بھی چلتا اور بدلتا رہا ہے۔ جس لحاظ سے وقت وحالات کے تقاضے ہوتے ہیں اس کے حساب سے ہی اس دور کا ادب بھی وجود میں آتا ہے۔ شاید اسی لیے ادب سماج کا آئینہ دار کہلاتا ہے کیوں کہ اس کے اندر انسان کے تمام تر ترقی وتمدنی صورتوں کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے عہد بہ عہد ارتقاء اور اس کے پس پردہ بدلتے ہوئے عوام کی زندگی کا محاسبہ ومحاکمہ کا بیان بھی کبھی شاعرانہ انداز میں پڑھنے کو ملتا ہے تو کبھی افسانوی انداز میں۔ کبھی ان کی طرف براہ راست اشارہ کر دیا جاتا ہے تو کبھی اشاروں، کنایوں یا علامتوں کے ذریعہ ایک مبہم سی بات کہہ کر چھوڑ دی جاتی ہے اور اس کے تاثر کا تمام دارومدار قاری کی منطق پر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اس کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ جدید افسانہ بھی اپنے دور اور اپنے وقت وحالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آیا اور بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہا لیکن ایک مدّت کے بعد جیسے تمام تحریکوں اور رجحانوں پر زوال آتا ہے یا یوں کہیں تو بدلاؤ آتا ہے اسی طرح جدیدیت پر بھی سماج نے قدیمیت کی مہر لگا دی اور دوسری تمام ادبی تحریکات کی طرح اس پر بھی ایک مدّت کے بعد جمود طاری ہونے لگا اور اس کے رجحان بھی بدل گئے جیسے ترقی پسند تحریک کے بدل گئے تھے۔

□□□

Dr. Kainat Ansari
Guest Faculty
Hamidia Girls Degree College
Prayagraj211003 (U.P)

طارق سہراب غازی پوری

مرد اور عورت کے مابین تفریق کیوں؟

یونائیٹڈ نیشنس کے چارٹر میں کہیں بھی یہ درج نہیں ہے کہ عورتوں کے حقوق مردوں کے مقابلہ میں کم یا کم تر ہونے چاہئیں یا عورتیں مردوں کی محکوم ہیں اسی طرح دیگر قومیں بھی عورتوں کو مردوں کے برابر درجہ دیتی ہیں تاہم پھر بھی آج کے دور میں عورتوں کے مسائل کچھ اس قدر ہیں کہ وہ سماج میں اپنے حقوق حاصل کرنے میں اپنے آپ کو احساس کمتری کا شکار پاتی ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے؟ اس مضمون میں ہم انہی باتوں پر روشنی ڈالنے کی سعی کر رہے ہیں یہ محسوس کرتے ہوئے کہ 'شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات'۔

اپنے مطالعہ کی روشنی میں میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ خواتین اپنے مسائل کے لیے خود ہی ذمہ دار ہیں کہیں کہیں گارجین اور بالخصوص جاہل مائیں اپنی جہالت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے لڑکا اور لڑکی کے مابین تفریق پیدا کر دیتی ہیں اور ان کے گھر اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو وہ اس قدر خوشی محسوس نہیں کرتیں جس قدر لڑکا پیدا ہونے کی خوشی میں کی جاتی ہے اور جب وہی لڑکی بڑی ہوتی ہے تو اپنے جاہل ماں باپ سے اپنے حق میں مایوس کن باتیں سنتے ہوئے بالآخر اپنے آپ کو سماج میں کمتر محسوس کرنے لگتی ہے لیکن دوسری طرف یہ باتیں ان گھروں میں نہیں سننے کو ملتی جن گھروں کے ماں باپ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور تعلیم کی وجہ سے بہتر سمجھداری رکھتے ہیں۔ آخر اس کا سد باب کیسے ہو؟ اس کے لیے کوشاں ہونے کی ضرورت ہے اور عورتوں میں تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ خواتین میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے شوہر انھیں محکوم بنا کر رکھتے ہیں اور وہ عورتیں بھی یہی سمجھتی ہیں کہ مرد ان کا حاکم ہے اور مرد کے غصہ کو سہنا ہی ان کا مقدر ہے۔ لہٰذا ایسی خواتین اپنی سوچ کو بدلیں اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ خالق کائنات نے کائنات میں انھیں کس اعلیٰ مقام پر فائض کیا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورت و مرد کے مابین تفریق ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔ مرد کی زندگی عورت کے بغیر ادھوری ہے اور اسی طرح عورت کی زندگی بھی بغیر مرد کے ادھوری ہے یعنی دونوں ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ اگر ایک پہیہ چھوٹا اور دوسرا قدرے بڑا ہو تو گاڑی کیسے چلے گی۔ اپنی باعزت بہنوں کو میں بتاتا چلوں کہ قدیم مصری 'مصوری' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ: عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عورت صرف گھریلو کام کرنے کے لیے ہے جو صحیح نہیں ہے۔ گھریلو کام انجام دینا تو اس کی دلچسپیوں اور کارکردگیوں کا نسبتاً ایک چھوٹا سا دائرہ ہے۔

مذہب اسلام نے تو عورتوں کو وہ بلند مقام عطا کیا ہے جس کی جتنی بڑائی کی جائے کم ہے۔ دیگر ادیان بھی عورتوں کے حقوق کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن عورتوں کی شادی کے بعد وہ عورت کو اس کے ماں باپ کی جاگیر میں حصے دینے کی باتیں نہیں کرتے مگر مذہب اسلام میں اگر عورت کی شادی کسی سے ہو جاتی ہے تو کہا گیا ہے کہ عورت اپنے ماں باپ کی جاگیر میں حصے دار ہے وہ اپنا حق شوہر سے بھی لے سکتی ہے اور ساتھ ہی اپنے ماں باپ سے بھی وابستہ رہتے ہوئے ان کی جاگیر میں حصے دار ہے۔

اسلام نے جس طرح عورتوں کے حقوق محفوظ رکھے ہیں انھیں صرف مسلم اسکالرز ہی نہیں بلکہ غیر مسلم دانشور بھی بڑی عزت و احترام کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ دیگر ادعیان کے مقابلہ میں مذہب اسلام نے عورتوں کو مردوں کے برابر کے درجہ میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہندوستان میں کچھ سماج ایسے بھی ہیں جہاں عورتوں کو ''تاڑن کی ادھیکاری'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ تلسی داس کی نظم کے حوالے سے یہ کہا جاتا ہے کہ پشو (جانور) اور عورتیں، مردوں کے برابری کے درجے میں نہیں آسکتیں، یہ سب درحقیقت تاڑن کے ادھیکاری ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے یہاں عورتوں کو نیچ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے سماج میں ماں باپ جب اپنی لڑکیوں کی شادی کر دیتے ہیں تو پھر ان لڑکیوں کو اپنی جائیداد میں حصہ نہیں دیتے اور وہ لڑکیاں اپنے شوہروں کے گھروں میں کس حال میں ہیں اس کی خبر گیری بھی نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی لڑکیوں کی شادی کر کے انھیں گھر سے باہر کر دیا، اب وہ ان کے جائیداد کی حقدار نہیں۔

دہلی ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب راجندر سچر جنھیں سچر کمیٹی کے حوالے سے اکثر لوگ جانتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ:

''مذہب اسلام عورتوں کے حقوق دینے کے معاملے میں انتہائی فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے۔ بقول ان کے یہ حقیقت ہے کہ 1956 میں ہندو کوڈ کی منظوری سے قبل خواتین کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا جبکہ اسلام عورتوں کو یہ حقوق 1400 سال پہلے ہی دے چکا تھا۔''

(روزنامہ اسٹیٹس مین بتاریخ 26 اپریل 1986)

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردوں کا تعلق اپنے گھر اور خاندان سے ہمہ وقت برقرار ہے اسی طرح عورت بھی اپنے ماں باپ کے گھر سے شادی کے بعد بھی ماں باپ کی جائداد میں حقدار ہے اور یہ ایک اہم بات ہے کہ اس کے لیے مذہب اسلام کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ بقول محققین کہ یوروپی معاشرے نے بھی اسلامی تعلیمات سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ دوسری طرف اسلام جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے عورتوں کو اخلاق کا پیکر اور تہذیب و تمدن کے بلند مقام پر فائض ہونے کے لیے بھی انھیں ترغیب دیتا ہے۔ شادی سے پہلے جب عورتیں اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوں تو وہ کس طرح رہیں اور شادی کے بعد ازدواجی زندگی میں اپنے شوہروں کے ساتھ کس قدر پیار و محبت کے ساتھ رہیں، اسلام ان تمام باتوں کے لیے ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ معاشرے کی تشکیل میں شوہر اور بیوی کا ایک اہم کردار ہوتا ہے اس لیے ان کے آپسی تعلقات میں جتنی محبت و انسیت ہوگی معاشرے میں اتنا ہی نکھار آئے گا۔ شوہر اور بیوی کے مابین محبت کے پیمانے کا جو تعین اسلام نے کیا اس کا اندازہ پیغمبر اسلام محمد صلعمؐ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو بیوی کو اپنے شوہر کے لیے ایسا کرنے دیتا''۔ قرآن پاک میں واضح حکم ہے کہ چاردن سورج کو سجدہ نہ کرو بلکہ صرف اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔

آپ حضور صلعم کی اس بات سے واضح ہونے والی حقیقت اس نقطے کی غمازی کرتی ہے کہ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے حق میں انسیت و محبت رکھنے والی ہو اور ساتھ ہی دیانت دار و وفادار ہو تاکہ اس کا شوہر بھی اسی طرح اس سے شفقت و محبت کرنے والا ہو۔

ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ درحقیقت عورت و مرد گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ایک خراب ہو یا چھوٹا بڑا ہو تو دو پہیہ والی سائیکل یا گاڑی نہیں چل سکتی اور اس نقطۂ نظر سے کوئی عورت کو اس کا مقام جو اسلام نے دیا ہے اگر نہ دے تو یہ عورت کے حق میں زیادتی ہوگی۔

اسلامی سماج میں مردوں کو ذمہ داری دی گئی ہے کہ وہ اپنی عورتوں کی ہر ممکن طور پر کفالت کریں۔ بیوی بچوں کو کھلانے پلانے کی پوری ذمہ داری شوہر پر عائد کی گئی ہے اور عورتوں کو کہا گیا ہے کہ وہ تہذیب کے دائرے میں رہ کر شاندار معاشرہ کی تشکیل کریں۔ حصول تعلیم میں دونوں کا دائرہ برابر ہے لیکن اس ضمن میں دانشوروں کا کہنا ہے کہ ایک لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا تشکیل سماج کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بقول ان کے:

A boy's education makes a man while a girl's education makes a nation.

'ایک لڑکے کی تعلیم ایک مرد کی تشکیل کرتی ہے جبکہ ایک لڑکی کی تعلیم سے پورا ایک معاشرہ تیار ہوتا ہے۔'

آج جو لڑکیاں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے بچوں کو خود بھی پڑھاتی ہیں اور ان کے آگے کی پڑھائی میں دلچسپی ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہندوستانی سماج میں خیالات کا فقدان ہے۔ بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کی تعلیم پر توجہ نہیں دیتے بلکہ کہیں کہیں تو اپنے لڑکوں اور لڑکیوں میں اتنی تفریق کرتے ہیں کہ لڑکیوں کو تعلیم نہ دے کر یا ان کی تعلیم کو روک کر لڑکوں کو ہی پڑھاتے ہیں اور ایسا ہونے سے ہی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اور عورتیں احساس کمتری کا شکار ہوتی ہیں۔

آگے چل کر اپنی جہالت کی وجہ سے بہتر شادیوں سے محروم رہتی ہیں۔ بے جوڑ شادیاں ہونے کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہتر معاشرہ کی تشکیل نہیں ہو پاتی ہے تو اپنی بہنوں سے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ وہ خوب پڑھیں اور تعلیم کے راستے اپنے آپ کو مزین کریں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اَلعِلمُ فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٌ و مسلمۃٌ''

ترجمہ: علم کا حاصل کرنا تمام مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

عورتوں اور مردوں میں کتنی خامیاں ہیں۔ اگر عورت و مرد تعلیم یافتہ ہوں تو بہتر معاشرے کا ظہور ہوتا ہے، اس کے برعکس دونوں اگر تعلیم سے دور ہوں تو بہتری کی امید کرنا حقیقت سے بعید ہے۔ ان باتوں کی روشنی میں میں ان تمام خواتین سے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کے لیے تعلیم کی طرف راغب ہوں۔ علم ایک خوبصورتی ہے جس کی خوبصورتی سے ایک پرکشش ماحول پیدا ہوتا ہے۔ مجھے کئی جگہوں پر یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ تعلیم یافتہ گھرانے کے لوگ غریب گھروں کی بچیاں جو تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، کو اپنی ازدواجی زندگی میں رکھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاید یہی ہے کہ تعلیم یافتہ بچیاں اپنی سلیقہ مندی سے شوہر کی الجھنوں کو دور کرتی ہیں جبکہ ایک غیر پڑھی ہوئی عورت ایسا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سی خواتین ایسی بھی ہیں جنھیں اپنے حقوق کا علم بھی نہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ تمام آزادیاں مردوں کے لیے ہیں اور وہ محکوم ہیں خواتین اپنے آپ کو کمتر نہ سمجھیں۔ اس معاملہ میں ان کے ماں باپ کو بھی سمجھنا پڑے گا کہ ان کی لڑکیوں کے ان پر کیا حقوق ہیں۔ اس سائنسی دور میں جبکہ تمام چیزیں چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح واضح ہو چکی ہیں کوئی خاندان اگر مرد اور عورت کے مابین تفریق کرتا ہے تو وہ سماج کے حق میں زیادتی کر رہا ہے۔ مرد اور عورت کے مابین تفریق نہیں ہونی چاہیے۔

□□□

Mr. Tariq Sohrab Ghazipuri
B-2 Mujeeb Bagh
Jamia Nagar
New Delhi-110025

ڈاکٹر فرزانہ خلیل

رسالہ ’جامعہ‘ کی تعلیمی و ادبی خدمات

ایک جائزہ

(1923 تا 1947)

رسالہ ’جامعہ‘ جس ادبی، تہذیبی، علمی، قومی اور سیاسی شعور کی نمائندگی کرتا رہا ہے اس کا پس منظر خود جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ محض ایک تعلیمی اداراہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی اور سیاسی تحریکات کا آئینہ دار بھی ہے، جس کی بنیاد 1920 میں علی گڑھ میں رکھی گئی تھی۔ ابتدا سے ہی یہ ادارہ ایک مخصوص فکری اور علمی تحریک کی ترجمانی کر رہا ہے اگر دیکھا جائے تو اس درسگاہ کا قیام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کارکردگی اور بطور خاص اس ادارے کی ایک مخصوص نہج اختیار کر جانے کا ردعمل تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا ابتدائی زمانہ ہماری متعدد قومی تحریکات کا زمانہ بھی تھا، اس لیے اس ادارے کے ترجمان ماہنامہ ’جامعہ‘ میں ان تحریکات کی دھمک کا سنائی دینا فطری تھا۔

رسالہ ’جامعہ‘ کی اشاعت کا سلسلہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے دو سال بعد ہی شروع ہو گیا تھا کیونکہ کسی بھی تعلیمی ادارے کے لیے ایک ایسے ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے جو ادارے کی سرگرمی، اساتذہ کی کارکردگی اور طلبا کے کارناموں کو دوسروں سے متعارف کرائے۔ رسالہ ’جامعہ‘ اپنے قیام کے وقت ہی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ترجمان رہا ہے۔ جس میں جامعہ کی فکر اور خیالات محسوس کیے جا سکتے تھے۔ ابتدا میں یہ خالص علمی اور فکری رسالہ تھا لیکن کچھ دنوں بعد اور خاص کر اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہیں ہوگی کہ پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کی آمد کے بعد اس رسالہ کے مزاج میں تبدیلی آئی اور اس میں ادبی مضامین کی وسعت بڑھی۔ اس میں ادبی موضوعات شامل ہوتے گئے۔ ابتدا میں اس رسالہ میں سیاسی و تعلیمی، مذہبی، تہذیبی موضوعات کی کثرت تھی کیونکہ وہ دور ہی سیاسی تحریکات کا دور تھا تقریباً 1926 سے یہ رسالہ اردو کے ایک ادبی، تعلیمی اور فکری رسالے کی حیثیت حاصل کر گیا۔ یہ رسالہ 1923 سے اشاعت پذیر ہے 1947 میں نامساعد حالات کی بنا پر تیرہ سال تک شائع نہیں ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد 1960 سے رسالہ ’جامعہ‘ کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی جو ابھی تک جاری ہے اور آج بھی یہ رسالہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ادبی، تہذیبی اور فکری ترجمانی کر رہا ہے۔

1923 سے 1947 کے درمیان اس رسالے کے جو مدیران تھے ان میں نور الرحمٰن، اسلم جیراجپوری، یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین، نور الحسن ہاشمی اور پروفیسر محمد عاقل کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو اپنے آپ میں خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔

رسالہ ’جامعہ‘ کی اگر تعلیمی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ ’جامعہ‘ نے 1923 سے 1947 تک اپنے صفحات میں تعلیمی موضوعات کی ایک بڑی مقدار کو سمیٹا ہے۔ جیسے جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیمی تجربات ہوتے رہے یعنی تعلیم بالغاں اور بنیادی تعلیم وغیرہ ان سب کا ذکر رسالہ ’جامعہ‘ کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین،

پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، سعید انصاری اور سلامت اللہ وغیرہ نے جو خطبات، رپورٹیں اور تقریریں کیں ان کو بھی اس رسالہ میں دیکھا جا سکتا ہے جو آج بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ تعلیمی موضوعات پر متفرق مضامین رسالہ میں شائع ہوتے رہے۔ جرمنی، چین، روس، امریکہ میں جو تعلیمی صورت حال اس وقت تھی اور ماضی میں رہی ہوگی ان پر سنجیدگی سے اس رسالہ میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان ممالک کی تعلیم کا ذکر کرنا 'جامعہ' میں اس لیے ضروری تھا تاکہ یہاں کے اساتذہ اور طالب علم وہاں کی تعلیم سے واقف ہو سکیں اور مستفید ہوں اور اپنی تعلیم کا معیار بلند کر سکیں۔ اس ادارے کا مقصد ہی اپنی قوم کی تعلیمی اصلاح کرنا اور نئے تقاضوں کے مطابق اسے رائج کرنا تھا۔ آئے دن تعلیمی نظریات بدل رہے تھے، نئی نئی ایجادات ہو رہی تھی زمانہ ترقی کی طرف گامزن تھا ایسے وقت میں تعلیم کے بارے میں سوچنا اور لکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اکابرین جامعہ تعلیمی مسائل کے بارے میں گہرائی کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ اس رسالے میں بعض اہل قلم نے دوسری زبانوں سے تعلیمی افکار کے تراجم بھی پیش کیے ہیں اس وقت کے ماہرین تعلیم نے تعلیم کا قومی زندگی اور اقتصادی مسائل سے رشتہ جوڑنے کے لیے جو قدم اٹھایا اور مضامین لکھے وہ توجہ طلب ہیں۔ مثلاً تعلیم اور کھیل، تعلیم اور سماج، تعلیم اور دستکاری، تعلیم بالغاں کے تجربے، تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت، تعلیم میں سیر و سیاحت کی اہمیت وغیرہ عنوانات کے تحت مختلف مضامین 'جامعہ' کے صفحات میں موجود ہیں۔ بعض مضامین جن کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں ہے سائنس اور تعلیم کے رشتہ پر بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔ یہ تمام مضامین تعلیمی نقطۂ نظر سے آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضمون نگاروں اور اہل قلم کے مضامین میں جو اپنے دور کے ماہرین تعلیم اور مفکر ہیں جن میں مولانا محمود الحسن، ڈاکٹر ذاکر حسین، یوسف حسین خاں، سعید انصاری، پروفیسر محمد مجیب، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سلامت اللہ، برٹینڈ رسل، عبد الغفور، ملا رموزی، توحیدی، ڈاکٹر فریڈرش البرٹ رائشی، بدر الدین چینی، سید وقار عظیم الہ آبادی، آل احمد سرور، مولانا سید سلیمان ندوی، توکل ڈبائیوی، خواجہ احمد فاروقی، لالہ لاجپت رائے، وغیرہ ان مضامین میں مغربی و بیرونی ممالک کے ماہرین تعلیم کے مضامین کے تراجم بھی موجود ہیں جو تعلیم کے میدان میں بیش بہا قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں اسلام اور تعلیم جدید، آزاد اسلامی اور قومی تعلیم، پرانے صوفی اور نئی تعلیم، تعلیم اور سماج، تعلیم اور نئے معاشرے کی تعمیر، تعلیم اور مسئلہ معاش، تعلیم کی نفسیاتی بنیاد، جان ڈیوی کے فلسفۂ تعلیم کا اثر، جدید تعلیمی انقلاب اور مسلمانان ہند کے تعلیمی مسائل، شہریت کی تعلیم، کاروباری تعلیم کے خطرات، مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ، ہندوستان اور مسئلہ تعلیم وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ موضوعات ایسے ہیں جنھیں آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح رسالہ 'جامعہ' کی تعلیمی خدمات سے انحراف کی بات تو الگ اس کی عظمت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی تعلیم کے میدان میں یہ مضامین اپنی اہمیت کے حامل ہیں۔

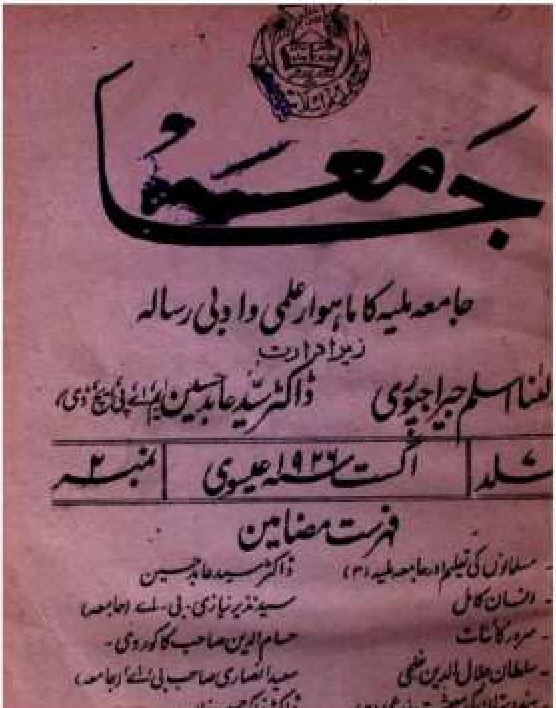
جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

زیر ادارت

...لنا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

...لد | اگست ۱۹۲۶ عیسوی | نمبر ۲

فہرست مضامین

- مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ (۳) — ڈاکٹر سید عابد حسین
- انسان کامل — سید نذیر نیازی بی۔ اے (جامعہ)
- سرور کائنات — حسام الدین صاحب کا کوروی
- سلطان جلال الدین خلجی — سید انصاری صاحب بی اے (جامعہ)
- ہندوستان کی معیشت زندگی (۲)

اس کے برعکس رسالہ 'جامعہ' کا مقصد صرف سیاسی، تہذیبی، تعلیمی، تاریخی مضامین شائع کرنا ہی نہیں تھا بلکہ علم و ادب کی تشہیر و تبلیغ بھی تھا۔ رسالہ 'جامعہ' میں ادبی مضامین کا سلسلہ تقریباً 1926 سے شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد ادب کا ایک بڑا ذخیرہ رسالہ 'جامعہ' میں موجود ہے۔ اس میں ادب کی سبھی اصناف شامل ہیں۔ جن میں ادبی مضامین، افسانے، ڈرامے، خاکے، سوانح، سفرنامے، تبصرے، جائزے، انشائیے اور مکتوب وغیرہ ہیں۔ اسی طرح شعری اصناف میں غزلیں، نظمیں، مراثی، رباعیات اور قطعات وغیرہ ہیں۔ ان ادبی مضامین میں وہ اہل قلم شامل ہیں جن کی عظمت و وقار رہتی دنیا تک قائم رہے گا ان میں مولانا اسلم جیراجپوری، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، محی الدین قادری زور، قاضی عبد الغفار، امداد صابری، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر محمد مجیب، عبد القیوم خاں باقی، شوکت سبزواری، ڈاکٹر عابد حسین، برکت علی فراق، مرزا فرحت اللہ

بیگ، سعید انصاری، احسن مارہروی، عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، رشید احمد صدیقی، سید نذیر نیازی، عبدالعلیم احراری، علامہ اقبال، محمد ابواللیث صدیقی، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی وغیرہ ان ادیبوں نے ان موضوعات کو رسالہ جامعہ میں پیش کیا ہے جن کی اہمیت عصر حاضر کے ادیبوں وقاری کے لیے مشعل راہ کا کام کر رہی ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر ان ماہرین قلم نے اپنی ذہنی فکر کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً ادب اور مذہب، ادب اور ادیب کا مقصد، اردو ادب 1941 میں، اردو رسم الخط، افسانے کا پلاٹ، افسانہ نویسی، اقبال اور قومیت، اقبال کا فلسفۂ حیات، اقبال اور کارل مارکس، تاریخ ادبیات ہند، تاریخ نثر اردو، جدید اردو شاعری کے بعض میلانات، حسرت موہانی کی شاعری، روسی انقلابی شاعری، شمالی اور دکنی اردو کی علیحدگی، شمالی ہندوستان کے دیہات کی زبان عربی رسم الخط، عربی شاعری کی ابتدا، علامہ اقبال کا فلسفہ، غالب اور قومی شاعری، کتب لغت عربی، لکھنوی ادب کا سماجی پس منظر، مولوی عبدالحق کی تنقید نگاری، مومن کی غزل گوئی، نثر میں شاعری، ہندوستان کی مختلف زبانیں اور ایک مشترکہ قومی زبان، ہندوستانی ڈرامہ، اس طرح رسالہ جامعہ نے اس ادبی ذخیرے کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹا جس میں ادب اور عالمی ادب کی ایک پوری تاریخ پوشیدہ ہے۔ علاوہ ازیں افسانے جس میں مشہور و معروف افسانہ نگاروں کے افسانے موجود ہیں ان میں اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، عاشق حسین بٹالوی، محمد مجیب، کوثر چاند پوری، سجاد ظہیر، منشی پریم چند، علی عباس حسینی۔ اس رسالے نے ترجمہ نگاری کی روایت کو بھی آگے بڑھایا اور سبھی اصناف میں دوسرے مضامین کے تراجم نہایت عمدگی اور سلیقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ اس رسالہ میں روسی، ترکی، اٹلی کے مشہور و معروف (چیخوف، موپاسا، سلمٰی لاگرلاف، آسکر وائلڈ، ٹالسٹائے، بیارنسن، ٹیلڈ اسیر او وغیرہ کے افسانوں کا ترجمہ بہت ہی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جو ترجمہ معلوم نہیں ہوتا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ انھیں ترجمہ نگاروں کی تخلیق ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو رسالہ جامعہ نے اپنے صفحات میں افسانوں کی ایک اچھی خاصی بڑی تعداد پیش کی ہے۔ یہ افسانے اپنے زمانے کے ادبی، تہذیبی، تاریخی اور معاشرتی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔

خاکہ نگاری بھی رسالہ 'جامعہ' کے صفحات میں نظر آتی ہے۔ خاکوں کے ساتھ ساتھ انشائی تحریریں بھی شامل ہیں جن میں پروفیسر مجیب کا انشائیہ 'تنہائی' اور جیلانی بانو کا انشائیہ 'غلطی کا احساس' قابل ذکر ہیں۔ رسالہ جامعہ کے صفحات میں سفرناموں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن میں چودھری مختار سنگھ کا 'جرمنی کا سفرنامہ' قاضی عبدالغفار کا 'رومۃ الکبریٰ' اور مولانا سورتی کا 'سفر حجاز' وغیرہ ہیں۔ اس رسالہ میں طنز و مزاح و مکتوب نگاری کا عنصر بھی گاہے گاہے نظر آتا ہے۔ ادب کا ایک بڑا حصہ شعری اصناف پر مشتمل ہے جس میں غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات، اور مراثی شامل ہیں۔ اس رسالہ میں 'ادبیات' کے عنوان سے شعر و ادب کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس کے تحت عظیم شعرا کا کلام قارئین جامعہ کے لیے پیش کیا جاتا تھا نومبر 1925 سے نومبر 1926 کے درمیان ''دامن گلچیں' کے عنوان سے ایک اور سلسلہ شروع کیا گیا تھا جس کے تحت اردو کے مشہور شعرا کا کلام شائع کیا جاتا تھا۔ یہ غزل کے عروج کا دور تھا اور اس دور کی شاعری کے جو چار ستون سمجھے جاتے تھے، حسرت، اصغر، فانی، جگر وغیرہ کی غزلیں اس رسالے کے صفحات میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے دیگر نمائندہ اور نوخیز شاعروں کو بھی اس رسالہ کے صفحات میں جگہ دی گئی ہے۔ ان نمائندہ شاعروں میں آل احمد سرور، اجمل خاں شیدہ، اسلم جیراجپوری، احمد ندیم قاسمی، اختر انصاری، بیدل، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، قائم چاند پوری وغیرہ کا کلام بھی اس رسالہ میں شائع ہوا ہے۔

اس رسالہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ شروع سے ہی ایک مخصوص حلقہ تک محدود رہا اور اس حلقے کو ہم جامعہ برادری کا نام دے سکتے ہیں۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو یا تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نظریے سے اتفاق رکھتے ہیں یا جامعہ سے کسی نہ کسی شکل میں منسلک رہے ہیں یا پھر جامعہ کے لیے کسی طرح کی نظری اور فکری اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کے محدود ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے مضامین ہمیشہ سنجیدہ اور فکر انگیز موضوعات سے متعلق ہوتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ہلکی پھلکی یا عامیانہ قسم کی تخلیقات شامل نہیں ہوتی۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسالہ 'جامعہ' کی ادبی و تعلیمی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس رسالہ نے ابتدا سے آج تک اپنا ایک معیار اور مزاج برقرار رکھا ہے اور اس میں ان ہی اہل علم و ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے جو علم و ادب کا ایک گہوارہ ہیں۔ آج بھی ہمارے قاری اور ادیب اس میں شامل تخلیقات سے مستفید ہو رہے ہیں۔

□□□

Dr. Farzana Khalil
F-148/1, Shaheen Bagh
Okhla, New Delhi-110025

ڈاکٹر محمد عرفان

جدید فارسی شاعری میں ایرانی شاعرات کا مقام

جدید اردو و فارسی شاعری کے ارتقا کا دور ایک ہی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اردو و فارسی شاعری نے جدید اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے دور میں انگریزی و فرانسیسی زبان و ادب لوگ پڑھنے لکھنے لگے تھے۔ ایران میں بھی ایرانی ادب میں تبدیلی آئی۔ یوروپی زبان و ادب خصوصاً فرانسیسی، انگریزی، روسی، و جرمنی کا مطالعہ عام ہوا۔ شاعر و ادیب بھی قدیم معنی و بیان و طرز روش سے ہٹ کر لکھنے لگے، اسی اثنا میں آزاد شاعری کو مقبولیت حاصل ہوتی چلی گئی۔

اس دور میں ان دونوں ملکوں میں روزنامہ نویسی و ادبی رسائل و جرائد کی اشاعت بھی عروج پر پہنچی۔ جدید شاعری کی مقبولیت و ترقی میں ان ادبی اردو و فارسی جرائد نے جدید شاعری کے فروغ و مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو میں اولین آزاد نظم لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر اور محمد اسماعیل میرٹھی جیسے شعرا کا نام لیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جدید فارسی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو نیما یوشیج کا نام لیا جاتا ہے، نیما یوشیج سے کچھ پہلے فارسی شاعری میں نو پردازی شروع ہو چکی تھی، مدیر روزنامہ نسیم شمال اشرف الدین گیلانی، پروین اعتصامی و علامہ دہخدا جیسے شاعروں نے اپنی شاعری میں عام فہم زبان میں نئے طرز روش کے ساتھ نئے مضامین منظوم کرنا شروع کر دیے تھے۔

خواتین ہمارے سماج کا اہم جزو ہیں، ادب اور علم و ہنر میں خواتین کا مقام ہمیشہ رہا ہے اور خواتین میں بڑی بڑی شاعرات بھی ہوئی ہیں اردو میں بھی اور فارسی میں بھی۔ اول نام ایران کی خاتون شاعرہ 'آتوسا' کا آتا ہے، جو داریوش بادشاہ کی بیوی تھی، جن کا زمانہ چھ سو قبل مسیح تھا، قدیم ایرانی زبان جو اس وقت رائج تھی، انھوں نے اس زبان میں شعر کہا۔ چوتھی ہجری میں رابعہ بلخی مشہور شاعرہ ہوئی، مھستی گنجوی چھٹی صدی، جہان ملک آٹھویں صدی ہجری، جمیلہ اصفہانی نویں صدی ہجری، ہلالی استرآباد دسویں صدی ہجری میں، شمس الملوک کراچی گیارہویں صدی ہجری میں۔ ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت کو فارسی زبان و ادب کی ترقی کا دور جانا جاتا ہے، جہانگیر کی بیوی نور جہاں بیگم اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء متخلص مخفی جیسی مشہور شاعرات کے نام آتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں 'ماہ لقا چندا بائی' اور 'لطف النساء امتیاز' کا شمار اردو ادب کی اولین خواتین شاعرات میں ہوتا ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دونوں کا ایک ہی دور تھا۔ 'چندا' نے اپنا دیوان 1798 میں مرتب کیا تھا۔ بیسویں صدی میں جن خاتون شعرا کا نام لیا جاتا ہے ان میں پروین شاکر، زہرا نگاہ، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، علینہ عترت کے ساتھ بے شمار شاعرات کا نام آتا ہے۔

جدید فارسی ادبیات کی خاتون شعرا کے فہرست میں پروین اعتصامی کا نام اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے جو جدید دور کی اردو شاعرہ پروین شاکر سے 46 سال پہلے پیدا ہوئیں۔ ان دونوں کا تعلق علمی و ادبی

گھرانے سے تھا۔ اعتصامی امریکن گرلز کالج تہران سے فارغ التحصیل تھیں اور پروین شاکر امریکہ سے بھی اعلیٰ سند یافتہ تھیں۔ دونوں شاعرات کے کلام کلاسیکل شاعری کے سانچہ میں ہے اور اپنی شاعری میں پس ماندہ طبقہ وسماج میں پھیلی ناانصافی وعورتوں کے مقام ومرتبہ کی باتیں ہیں اور صوفیانہ رنگ بھی غالب ہے۔ ان دونوں شاعرات کی زندگی بہت مختصر رہی ہے۔

پروین اعتصامی کے بعد جدید فارسی شاعرات میں جو اہم نام آتے ہیں ان میں فروغ فرخ زاد، سیمین بہبہانی، اوران کی والدہ فخر اعظمی ارغن، سیما کلبائی، فاطمہ بلگرامی، بانو حمیدہ سپہری[1] (سہراب سپہری دورہ جدید کے مشہور شاعر ہوئے، ان کے والدہ بانو حمیدہ سپہری بھی شاعرہ تھی۔) پیرایہ یغمائی، منصورہ نیکوگفتار، فروغ میلانی، گراناز موسوی، پروانہ ملک زادہ، نسرین جافری، بنفشہ حجازی، سوسن فلاح، ہمایوں تاج طباطبائی، طاہرہ صفارزادہ وغیرہ ہیں۔

ان سبھی درج بالا شاعرات میں سے صرف چار جدید دور کے فارسی ادب کی شاعرات پروین اعتصامی، فروغ فرخ زاد، سیمین بہبہانی، طاہرہ صفارزادہ ہیں۔ انھیں ہم جدید فارسی خواتین شاعری کے چار ستون کہیں تو بے جا نہ ہوگا ان چاروں شاعرات کی زندگی وشاعری کا مختصر مطالعہ مضمون میں کیا گیا ہے۔

پروین اعتصامی

رخشندہ پروین اعتصامی 1907 میں تبریز میں پیدا ہوئیں۔ پروین اعتصامی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ پروین سات یا آٹھ سال کی تھیں جب اُن کی شاعری میں ذوق نمایاں ہونے لگا تھا۔ اُن کے والد نے اُن کا یہ ذوق دیکھتے ہوئے حوصلہ افزائی کی۔ 1922 میں اُن کی پہلی شعری نظم رسالہ 'بہار' میں چھپی۔ 1935 میں پروین کا شعری مجموعوں پر مبنی دِیوان شائع ہوا، جس میں 156 نظمیں تھیں۔ اِس دیوان کے لیے ایک تقریظ مشہور فارسی شاعر بہار مشہدی نے لکھی۔

1934 میں پروین کی شادی ہوئی اور وہ کرمان شاہ منتقل ہوگئیں۔ مگر یہ شادی صرف دس ہفتوں تک رہ سکی اور وہ واپس تہران آگئیں۔ ایک لائبریری 'دانش گاہِ سرائے عالی' میں ملازمت کرتی رہیں۔ پروین کے اِس دِیوان کا دوسرا ایڈیشن اُن کے بھائی مرزا ابوالفتح اعتصامی نے پروین کی وفات کے بعد شائع کیا۔ یہ ایڈیشن سابقہ کے مقابلے میں ضخیم تھا، اِس میں 209 مختلف شعری مرکبات جن میں قصیدہ، غزل، قطع اور رباعیاں شامل تھیں اور کل اشعار کی تعداد 5606 تھی۔ 1938 میں جب پروین کے والد مرزا یوسف اعتصامی آشتیانی کا اِنتقال ہوا تب پروین کی عمر 31 سال تھی۔

اپنی مختصر سی حیات میں پروین بڑے شعرا کے مد مقابل آگئی تھیں۔ اُن کی شاعری کلاسیکی انداز کی ہے۔ اُن کے شعری مجموعوں میں 42 قصیدے اور قطعہ ایسے ہیں جن کا کوئی عنوان منتخب نہیں کیا گیا۔ یہ قدیم فارسی شعرا سنائی اور ناصر خسرو سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بعض دوسرے قصیدے فطرت، حالات اور زندگی کو نمایاں کرتے ہیں۔ پروین کے دِیوان میں کچھ غزلیں عشقیہ زندگی کے متعلق بھی ہیں جو اُن کے رومان پسند ہونے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

پروین کے دِیوان میں مناظرے کی شاعری زیادہ مفصل انداز میں پائی جاتی ہے۔ مناظرے کے انداز میں کل 65 نظمیں موجود ہیں۔

پروین اعتصامی کا اِنتقال 34 سال کی عمر میں 5 اپریل 1941 شہر قم میں ہوا۔ پروین کو قم میں اُن کے والد کے قریب دفن کیا گیا۔

اگرچہ پروین اعتصامی کلاسیکی اسلوب وقوالیب سے کبھی دور نہیں ہو پائیں لیکن اس کے باوجود انھوں نے سادہ زبان میں شعر کہے جو عام لوگوں کے لیے قابل فہم ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہیں۔ ان کی کوشش تھی کہ ادبی زبان کو عامیانہ زبان سے قریب لایا جائے تا کہ ادیبوں اور عوام کے درمیان پایا جانے والا فاصلہ کم ہو جائے۔ پروین کی بیشتر معروف نظمیں مثنویات، قصائد اور قطعات پر مشتمل ہیں۔ سادہ اسلوب کی بنا پر انھیں سبک خراسانی کا پیرو سمجھا جاتا ہے۔

فروغ فرخ زاد

فروغ فرخزاد 1934 میں تہران میں پیدا ہوئیں۔ والد فوج میں کرنل تھے۔ ہائی اسکول سے ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد رسمی تعلیم کو خیر باد کہا۔ سولہ سال کی عمر میں ایک سرکاری ملازم سے شادی کر لی۔ شادی کے ایک سال بعد 1952 میں ان کا شعری مجموعہ 'اسیر' شائع ہوا۔ اہوز منتقل ہونے سے قبل انھوں نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔ ان کا خاوندان کا بچّہ اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کچھ عرصے بعد تہران واپس آئیں۔ ان کی نظم 'ہمیں سرد موسم کی ابتدا پر یقین کرنے دو'۔۔۔ کو جدید ساختیاتی فارسی کی

منفرد نظم کہا گیا ہے۔ ان کی فارسی شاعری کا ترجمہ انگریزی میں 'شوہل ولپ' نے کیا ہے۔ فروغ فرخ زاد شاعرہ ہونے کے علاوہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی تھیں۔ ان کی ایک دستاویزی فلم 'گھر سیاہ ہے' کو بہت شہرت ملی۔ فروغ 1967 میں بتیس سال کی عمر میں ایک بس حادثے میں شدید زخمی ہوگئیں، ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کے بعد ان کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا۔ ان کے شعری مجموعہ دیوار، اسیر، عصیان، تولدی، تولدی دیگر مشہور ہیں۔ ان کی نظم 'جمعہ' کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

خاموش جمعہ،
جمعہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے
جمعے کی پچھلی گلیاں، پرانی زبوں حالی
جمعے کی افسردگی، خیالات پس مردہ ہو رہے ہیں
جمعے کی کھچاوٹ کی انگڑائی۔۔۔۔۔ قربانی دے رہی ہے
بے کار جمعہ
گھر خالی ہے
اداس گھر
کواڑ کے سامنے نوجوان آرہا ہے
اندھیرا گھر، لاحاصل سورج کو بلا رہا ہے
ویرانی کا گھر، شک، غیبت دانی
گھر کے پردے، گھر کی کتابیں، خلوت خانہ اور گھر کی تصویریں
آہ۔۔۔ میری زندگی گزر گئی، تکبر کی خاموشی سے
ایک انجانی ندی
پنالی اس بے زبان دل پر گرتی ہے، جمعہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے
یہ دل خالی ہے، گھر اجڑتے ہیں
اور میری زندگی بیت گئی، خاموشی اور تکبر سے

سیمین خلیلی

سیمین خلیلی سال 1927، میں پیدا ہوئیں، بنام سیمین بہبہانی مشہور ہوئیں۔ ان کے والد صحافی علامہ ملا علی رازی خلیلی قاجاری دور میں ایران میں بادشاہت کے خاتمہ اور جمہوریت کے قیام کی تحریک میں شامل تھے، اور فارسی و عربی زبان کے شاعر تھے، والدہ سیمین فخر عظمی فرانسیسی زبان کی معلم تھیں اور وہ انجمن خواتین ایران کی خاص رکن تھیں، مشہور لکھاری و قومی شاعرہ ایران، سماجی خدمت ادب و تحقیق سے دلچسپی لی

اور غزل کے انداز میں جدید شاعری کی۔ زمانہ طالب علمی میں حسن بہبہانی سے شادی کی، اسی مناسبت سے سیمین بہبہانی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سیمین کی دوسری شادی منوچہر کوشیار سے ہوئی، سیمین تیس سال درس

وتدریس سے منسلک رہیں۔ کئی ملکی وغیر ملکی سرکاری اعزازات وانعامات سے نوازی گئیں۔[2]
(Prize for Women's Freedom (2009) and the Janus Pannonius Poetry Prize(2013)

سیمین کونوبل انعام بھی ملا، سیمین اوائل نے جوانی میں غزل اور چہار پارہ سے شاعری شروع کی اور جدت پیدا کی اور اپنے کلام میں سماجی زندگی کو شامل کیا۔ با 'مادرم ہمراہ' ان کی سوانح زندگی ہے۔ 'دوبارہ میسازمت وطن' میں ایران کی سماجی زندگی میں تبدیلی چاہتی ہے، جس کا اظہار اس کتاب میں ہے، سیمین نے شاعری کے علاوہ ناول بھی لکھیں، بیس سے زائد ان کی کتابیں قارئین کی دلچسپی کا سامان ہیں۔ شاعری میں سیمین نے نئی بحر بھی ایجاد کی۔ ایران میں مادر شاعر غزل نیمائی[3] (جدید فارسی شاعری میں نیما یوشیج نے شاعری میں پرانی روش وقافیہ وردیف کو توڑا اور شاعری کی، نیما کے طرز کی شاعری کو شعر نو وشعر نیمائی کے نام سے جانتے ہیں) کے لقب سے بھی مشہور ہوئیں۔ صدر امریکا اوباما نے اپنے بیان میں سیمین کا ذکر کیا، سیمین نے 2014 میں وفات پائی۔

طاہرہ صفارزادہ

طاہرہ صفارزادہ سال 1936 میں شہر کرمان میں پیدا ہوئیں۔ چھ سال کی عمر میں قرآن وعربی زبان کی تعلیم مدرسہ میں شروع کی، قرآنی تعلیمات سے پوری طرح مزین تھیں۔ طاہرہ جب پانچ سال کی تھیں تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا، ان کے چالیس دن بعد ہی ان کی والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ پرورش وتعلیم وتربیت بڑی بہن نے کی۔ انگریزی زبان

وادب سے پوسٹ گریجویشن کیا، ذہنی وسعت اس قدر تھی کہ ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوسکی اور اپنے شوہر سے جدا ہوگئیں مزید اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے لیے انگلینڈ اور امریکہ گئیں۔ قرآن کا ترجمہ فارسی وانگریزی زبان میں کیا، ترلان یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں، شعر نو جس کو اردو شاعری میں آزاد شاعری کے نام سے جانتے ہیں، اسی صنف میں شاعری کرتی رہیں، ان کا ایک مجموعہ کلام انگریزی زبان میں بھی ہے، ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے اور سماجی زندگی کی عکاسی بھی ہے۔ ایران کی کئی ادبی وعلمی انجمنوں کی رکن بنیں، تحریک انقلاب اسلامی ایران کی طرفدار رہیں، حکومت شاہنشاہ آریہ مہر پہلوی ایران کی مخالف تھی، خادم قرآن کی حیثیت سے ایران واسلامی ملکوں میں مشہور ہوئیں۔ ترجمہ میں مہارت رکھتی تھیں۔ کچھ وقت پٹرولیم کمپنی میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔ کئی تحقیقی کتابوں کی مصنفہ وبے شمار مقالات انھوں نے تحریر کیے ہیں۔ فن ترجمہ پر خاص تحقیق ہے شاعری سے بچپن سے لگاؤ رکھتی تھیں، تیرہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ شعر جدید پر کئی مقالات مختلف زوایہ سے لکھتی رہیں۔ طاہرہ نے 2008 میں تہران میں وفات پائی۔ مجموعہ شعر؛ رہ گذر مہتاب، سرخ چتر (انگریزی)[4] (Red Umbrella) طنین در دلتا، سد و بازوان، سفر پنجم، حرکت و دیروز، بیعت با بیداری، مردان منحنی، دیدار با صبح اہمیت کے حامل ہیں۔

طاہرہ صفارزادہ نے فروغ فرخ زاد کی شاعری کو تنقیدی نظر سے دیکھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت ومرتبہ اور بچوں کی تربیت کی مناسبت سے ان کی کئی نظمیں ہیں۔ درج ذیل شعر کا فارسی ترجمہ اردو میں حسب ذیل ہے:

قرآن:
بخوان بلند بخوان
در صبح این تلاوت معصومانہ
صدای ناب اذان می آید
وقتی صدای ناب اذان می آید
دل در حضوری آید
دل حاضر است
وہم "گرم بودن" خودرا
از نور این پیام قدسی بی مرز
از بطن این ستون صوتی معنا
بر می دارد

ترجمہ:

پڑھ! گاباصدای بلند
صبح میں تلاوت قرآن معصومانہ
اذان کی خالص آوازیں
جب اذان کی خالص آواز آجائے
دل وجود میں آتا ہے
دل تیار ہے،
اوران کا گرمجوشی سے انتظار ہے
اس مقدس پیغام کی روشنی لامحدود
اس ستون دل سے پر معنیٰ صوتی
اٹھاتا ہے۔"

ان چار جدید فارسی کی خواتین شاعرات کی زندگی و شاعری کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان شاعرات نے اپنے وقت کی سماجی زندگی کو اجاگر کیا ہے اور حقوق نسواں کی علمبردار رہی ہیں۔ پروین اعتصامی نے جس وقت شاعری کی اس وقت ایران میں پوری طرح جمہوریت فعال نہ تھی، جاگیردارانہ نظام غالب تھا۔ فروغ فرخ زاد کے وقت میں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی، اس دور میں ایران میں مغربی تہذیب وطرز زندگی کی مقبولیت بڑھی۔ فروغ کی طرز زندگی مغربی طرز کی زندگی رہی، جس کا فروغ نے اپنی شاعری میں ذکر کیا ہے اور مغربی ملکوں کی طرح آزادی نسواں کی طرفدار رہی۔ اسی زمانہ میں ایرانی علما و دانشوران نے پہلوی حکومت اور مغربیت کے خلاف تحریک چلائی اور ایران میں اسلامی فکر وعمل کی حکومت قائم ہوگئی۔ اسی ماحول میں سیمین بہبہانی اور طاہرہ صفارزادہ کی شاعری نے ایران میں مقبولیت حاصل کی۔ یہ دونوں شاعرہ بھی حقوق نسواں کی علمبردار تھیں، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ سیمین اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریہ حکومت سے خوش نہ تھیں خصوصاً عورتوں کے حوالہ سے جس کا سیمین نے اپنی کتاب اور شاعری میں ذکر کیا ہے۔ دوسری طرف ان کی ہمعصر طاہرہ کی شاعری تھی، گرچہ مغربی تہذیب وعلم حکمت سے طاہرہ پوری واقفیت رکھتی ہیں، اپنی تعلیم و تحقیقی کام کی غرض سے مغربی ملکوں میں رہیں پھر بھی نظریہ اسلامی جمہوریہ ایران کی طرفدار وحامی رہیں جس کا ذکر انھوں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔

سیمین اور طاہرہ دو نظریہ وفکر کی شاعرات ہیں اور دونوں ایران میں مقبول رہی ہیں، اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایرانی معاشرہ کا ایک طبقہ موجودہ اسلامی فکر وعمل کی حکومت سے راضی ہے، لیکن دوسرا طبقہ اس حکومت سے خوش نہیں ہے۔

کتابیات:

آریانپور، یحیی، از نیما تا روزگار ما، انتشارات، زوار، تہران، 1374

حسن لی، دکتر کاووس، گونہ نوآوری، نشر ثالث، تہران، 1380

حاکمی، اسماعیل، ادبیات معاصر، دانشگاہ پیام نور، 1373

خانلری، دکتر پرویز ناتل، فرہنگ و اجتماع، انتشار طوس، 1367

راشد، ن.م، ایران میں اجنبی، گاردی ترست، لاہور، 1969

حبیب، دکتر جاوید علیم صبا نویدی، آزاد شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی بمبئی علی گڑھ، 1981

لال، کرشن، ادوہنیک ہندی ساہتیہ کا اتیہاس، ہندی پریسد پرکاشن، دانشگاہ پریاگ، 1965

□□□

Dr. Md. Irfan
B-130, 8 No. Thokar
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi-110025

ملک کی آئین سازی میں خواتین کا کردار

عبدالواحد

اکثر جب ہم خواتین کے رول کے بارے میں بات کرتے ہیں تو زیادہ تر بحث صرف خواتین کے حقوق کے تحفظ یا شادی بیاہ کے مسائل تک ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تحریک آزادی میں خواتین کے رول پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ملک کا اکثر و بیشتر شہری ان کے نام سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن جب بات آزادی کے بعد آئین سازی کے مرحلے کی آتی ہے تو ہمارا سماج خواتین کے رول سے ناواقف نظر آتا ہے۔ اس مضمون میں اسی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان خواتین کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جن کی قربانیوں کی بدولت ہم ملک کو ایسا مثالی آئین دے پائے۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ ملک کا آئین 26 جنوری 1950 کو نافذ العمل ہوا۔ جس کی یادگار کے طور پر ہر سال 26 جنوری کو ہم سب یوم جمہوریہ کا غیر معمولی تہوار مناتے ہیں۔ آئین کو ترتیب دینے میں 2 سال 11 مہینے اور 18 روز کا وقت لگا۔ آئین کو تحریری شکل دینے کے لیے جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اس کے سربراہ ڈاکٹر بھیم راو امبیڈکر تھے۔ ان کے علاوہ دیگر 284 افراد، جو کہ ماہر قانون تھے یا پھر سماجی امور کے ماہرین تھے، انھوں نے بھی خدمات انجام دی تھیں لیکن ان خواتین کا ذکر کم ہی آتا ہے جن کی بدولت خواتین کے حقوق سے متعلق دفعات آئین کا حصہ بنیں۔

آیئے ایک نظر ان خواتین کی بیش بہا خدمات پر بھی ڈالتے چلیں جن کی بدولت یہ آئین سماج کو بہتری کی طرف گامزن کرنے میں موثر کردار ادا کر رہا ہے۔

1۔ اموسوامی ناتھن

اموسوامی ناتھن کیرل کے پال گھاٹ ضلع کے اناکارا میں 1894 میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے انھوں نے ایک تحریک چلائی اور اینی بیسینٹ اور مالتی پٹ وردھن کے ساتھ مل کر وومن انڈیا ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ جنسی مساوات کے ضمن میں ان کی تحریک کو کافی پذیرائی ملی۔ خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے انھوں

نے بھرپور کوششیں کیں۔ 1946 میں یہ آئین ساز اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ آئین ساز اسمبلی کی ممبر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے آئین سازی میں موثر رول ادا کیا اور جنسی مساوات سے متعلق دفعات کی آئین میں شمولیت کے لیے ان کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جنسی مساوات سے متعلق مسودہ انھوں نے ہی تیار کرکے ڈاکٹر امبیڈکر کو پیش کیا تھا۔ آئین کی تکمیل کے بعد بھی یہ سرگرم رہیں اور 1952 میں لوک سبھا الیکشن میں بھی کامیابی حاصل کی۔ 1954 میں ان کو راجیہ سبھا کے لیے بھی منتخب کیا گیا تھا، 1978 میں ان کا انتقال ہوا۔

2۔ دکشیانی ویلایودھن

دکشیانی ویلایودھن ملک کی پہلی دلت گریجویٹ خاتون تھیں۔ 1912 میں کیرل کے ارناکلم ضلع میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ آئین ساز اسمبلی کی واحد دلت خاتون ممبر تھیں۔ انھوں نے سماج کے دبے کچلے طبقے کی بہتری کے لیے کام کیا۔ ہمارے ملک کے آئین میں پسماندہ اور دلت طبقات کے لیے جو تحفظات شامل کیے گئے ہیں ان میں ان کا بھی اہم رول ہے۔ انھیں کی تجویز تھی کہ عام انتخابات کے ذریعے منتخب ہوکر آنے

والے اراکین پارلیمان سے توثیق کے بعد آئین کو نافذ کیا جانا چاہیے۔ 20 جولائی 1978 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں کیرل کی موجودہ حکومت نے ایک ایوارڈ شروع کرنے کا بھی اعلان کیا جو خواتین کے حقوق کے ضمن میں نمایاں کارکردگی ادا کرنے والی خواتین کو دیا جائے گا۔

3۔ کملا چودھری

کملا چودھری 22 فروری 1908 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد برطانوی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ایک متمول خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود، تعلیم ان کے لیے ایک چیلنج تھا۔ سماجی بندشوں کے باوجود انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ہندی ادب میں رتنا اور پربھاکر کے امتحانات پاس کیے۔ مئی 1923 میں اتر پردیش کے میرٹھ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر جے ایم چودھری سے شادی ہونے کے بعد میرٹھ میں منتقل ہوگئیں۔ شادی کے بعد ہندی ادب سے ان کا لگاؤ پروان چڑھا اور شوہر کی مدد سے انھوں نے آزادی کی تحریک کے لیے کئی مقالے لکھے۔ جن میں 'گاندھی بن جاؤں' کتاب بہت مقبول ہوئی۔ ان کے قلم کا جادو اس قدر چھایا کہ یہ اس دور کے ہندی ادب کا ایک چمکتا ستارہ بن گئیں۔ ان کو برطانوی حکومت نے جیل بھی بھیجا لیکن انھوں نے لکھنا بند نہیں کیا۔ آج بھی ان کی تحریریں ہندی کے نسائی ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ جب آئین ساز اسمبلی تشکیل دی گئی تو یہ بھی اس کی رکن منتخب ہوئیں۔ کسانوں کے استحصال اور ہندو معاشرے میں بیوہ عورتوں کے حقوق کے لیے انھوں نے سرگرم رول ادا کیا اور ان امور کو آئین میں شامل کرانے کے لیے انھوں نے بھرپور انداز میں بحث کی۔ دیہی علاقوں میں چھوٹے چھوٹے روزگار پیدا کرنے اور کھادی کو فروغ دینے کے لیے ان کی کوششوں کی ستائش کی جاتی ہے۔

4۔ بیگم اعزاز رسول

یہ آئین ساز اسمبلی کی واحد مسلم خاتون ممبر تھیں۔ پنجاب کے مالیر کوٹلہ کے نواب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ 2 اپریل 1909 میں یہ پیدا ہوئیں۔ 1937 میں انھوں نے سیاست میں قدم رکھا۔ حالانکہ ان کا تعلق ایک نواب اور زمیندار خاندان سے تھا لیکن انھوں نے زمینداری کے خاتمے کے لیے تحریک چلائی تھی۔ انھوں نے مذہب کی بنیاد پر علیحدہ

انتخابی حلقے بنائے جانے کی بھی مخالفت کی تھی۔ 1952 میں یہ راجیہ سبھا کے لیے منتخب ہوئیں۔ سال 2000 میں انھیں پدم بھوشن اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔ آئین ساز اسمبلی میں یہ اقلیتوں کے حقوق سے متعلق امور کی سربراہ تھیں۔ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرانے والی دفعات کے آئین میں شمولیت کے ضمن مین ان کا اہم رول تھا۔ یکم اگست 2000 میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

5۔ درگا بائی دیشمکھ

درگا بائی دیشمکھ 1909 میں آندھرا پردیش کے راجمنڈری ضلع کے کاکیناڑہ میں پیدا ہوئیں۔ محض 12 سال کی عمر میں یہ تحریک آزادی سے منسلک ہوگئی تھیں۔ انھوں نے 1930 کے مدراس کے نمک ستیہ گرہ میں بھی حصہ لیا تھا۔ 1942 میں مدراس یونیورسٹی سے قانون میں ڈگری لی اور مدراس ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی۔ تحریک آزادی سے وابستہ ہونے کے باعث انھیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کے دوران یہ واحد خاتون تھیں جنھیں آئین ساز کمیٹی کے چیئرمین کے پینل میں شامل کیا گیا تھا۔ سماجی فلاح و بہبود کے ضمن میں انھوں نے متعدد تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے ہندی اور اردو دونوں کو یکجا کرکے ہندوستانی زبان کو ملک کی قومی زبان کے طور پر نافذ کرنے کی بھی تجویز پیش کی تھی۔ انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ سب کو ہندی سیکھنی چاہیے اور جو لوگ ہندی نہیں جانتے ان کو ہندی پڑھنے کے لیے 15 سال کا وقت دیا جانا چاہیے۔ 9 مئی 1981 کو آپ کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے آپ کو پدم بھوشن اعزاز سے بھی سرفراز کیا۔

6۔ ہنسا جیوراج مہتا

یہ بھی ان 15 خواتین میں شامل تھیں جن کو آئین ساز اسمبلی کا ممبر منتخب کیا گیا تھا۔ یہ بنیادی حقوق سے متعلق کمیٹی کی ممبر تھیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے سماجی مساوات اور انصاف کے لیے مہم جوئی کی۔ حقوق نسواں کے لیے چارٹر مرتب کرنے کا سہرا انھیں کے سر جاتا ہے۔ 1948 میں اقوام متحدہ حقوق انسانی کونسل میں بھی انھوں نے ہندوستان کی نمائندگی

کی تھی۔ یہ یونیسکو کے ایگزیکیٹو کمیٹی کی ممبر بھی تھیں۔ 3 جولائی 1897 کو گجرات کے بڑودہ میں ان کی پیدائش ہوئی تھی اور 4 اپریل 1995 کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں پدم بھوشن اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔

7۔ لیلا رائے

یہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے نظریات کی حامل تھیں۔ ملک کے تعلیمی اداروں میں طالبات کی یونین قائم کرنے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔ ان کی پیدائش سال 1900 میں آسام کے گولپاڑہ میں ہوئی لیکن تعلیم و تربیت غیر منقسم ہندستان کے ڈھاکہ شہر میں ہوئی، جواب بنگلہ دیش کی راجدھانی ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے والی پہلی خاتون تھیں۔ یہ بنگال کی واحد خاتون تھیں جنھیں آئین ساز اسمبلی کی رکنیت دی گئی تھی۔ خواتین میں تعلیم کو فروغ دینے کے ضمن میں انھوں نے آئین ساز اسمبلی میں تجاویز پیش کی تھیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے بنگال خطے میں خواتین کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے میں یہ پیش پیش رہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے دوران بھی انھوں نے قومی یکجہتی کے فروغ کے لیے موثر رول ادا کیا۔ 1970 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

8۔ مالتی چودھری

عدم تعاون کی تحریک میں مہاتما گاندھی کے شانہ بشانہ کھڑی خواتین میں ایک نمایاں نام مالتی چودھری کا بھی ہے۔ حالانکہ ان کی پیدائش 1904 میں غیر منقسم ہندوستان کے بنگال میں ہوئی جو اب بنگلہ دیش کہلاتا ہے لیکن ان کی پرورش کلکتہ میں ہوئی۔ نابھ کرشن

چودھری سے شادی کے بعد یہ اڑیسہ منتقل ہوگئیں۔ ناب چودھری آزادی کے بعد اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ بھی رہے۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں ان کے رول کی کافی ستائش کی جاتی ہے۔ آئین ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد انھوں نے تعلیم کے فروغ سے متعلق امور پر تجاویز پیش کی تھیں۔ دیہی علاقوں میں تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے انھوں نے مہم بھی چلائی تھی۔ آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کے باعث انھیں کئی بار برطانوی حکومت نے جیلوں میں بھی ڈالا لیکن ان کے پائے استقامت میں تزلزل نہیں آیا۔ 1998 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

9۔ پورنیما بنرجی

آئین ساز اسمبلی کی 15 خاتون اراکین میں پورنیما بنرجی بھی شامل تھیں۔ یہ ارونا آصف علی کی چھوٹی بہن تھیں۔ ٹریڈ یونین، کسانوں کے یونین اور دیہی باشندوں کو تحریک آزادی میں جوڑنے کے لیے ان کی جدو جہد کو یاد کیا جاتا ہے۔ آئین ساز اسمبلی کے رکن کے طور پر انھوں نے ملک کی ترقی میں دیہی علاقوں کی شراکت داری کو یقینی بنانے جیسے امور پر تجاویز پیش کی تھیں۔ اتر پردیش کے الہٰ آباد میں 1911 میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ انگریزو بھارت چھوڑو تحریک میں انھوں نے خواتین کی ریلیوں کی قیادت کی۔ آزادی کے بعد یہ زیادہ دنوں تک روبہ صحت نہیں رہ سکیں۔ خرابیٔ صحت کے باعث 1951 میں ہی نینی تال میں ان کا انتقال ہوگیا۔

10۔ امرت کور

حالانکہ ان کا نام امرت کور تھا لیکن نیو یارک ٹائمز نے ان کی موت پر انھیں ہندستان کی شہزادی سے موسوم کیا تھا اس وجہ سے ان کو راج کماری امرت کور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بھارت کے آئین کو مرتب کرنے والی آئین ساز اسمبلی کی 15 خاتون اراکین میں یہ بھی شامل تھیں۔ پنجاب کے کپورتھلا راج گھرانے سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی پیدائش 2 فروری 1889 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ انھوں نے برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی

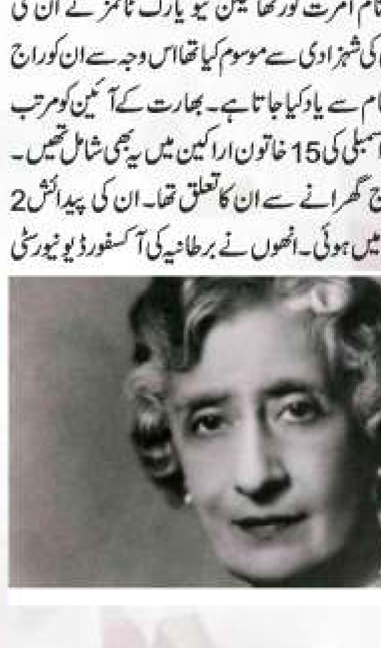

سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد یہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئیں۔ کم عمری کی شادیوں اور خواتین کے استحصال کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی۔ آئین ساز اسمبلی میں یہ بنیادی حقوق اور اقلیتوں سے متعلق امور کی کمیٹیوں کی ممبر تھیں۔ انھیں آزاد ہندوستان کی پہلی وزیر صحت ہونے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔ 1964 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

11۔ رینوکا رائے

محض 16 سال کی عمر سے ہی تحریک آزادی میں شامل ہونے والی رینوکا رائے کا تعلق مغربی بنگال کے مالدہ سے تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپسی پر انھیں انڈین ایجوکیشن سروس کا رکن بھی مقرر کیا گیا۔ برطانوی دور حکومت میں کلکتہ کے مشہور پریزیڈینسی کالج کی ہندوستانی پرنسپل ہونے کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ 146-47 میں یہ آئین کو مرتب کرنے کے لیے تشکیل دی گئی آئینی اسمبلی جسے مجلس دستور ساز بھی کہا جاتا ہے اس کی رکن منتخب ہوئیں۔ خواتین کو ان کے قانونی آئینی حقوق کے تعلق سے بیدار کرنے کے لیے انھوں نے باقاعدہ مہم چلائی تھی۔ 1957 اور پھر 1962 میں انھوں نے لوک سبھا میں مالدہ کی نمائندگی بھی کی۔ ان کی خدمات کے عوض انھیں 1988 میں پدم بھوشن سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ 1997 میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

12۔ سروجنی نائیڈو

یہ نام کسی ہندوستانی کے لیے تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ 13 فروری 1879 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں سروجنی نائیڈو تحریک آزادی

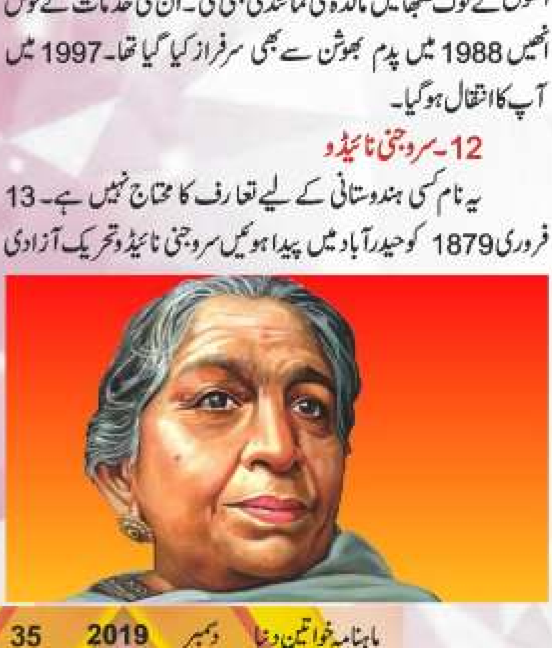

کی ایک سرکردہ لیڈر تھیں۔ انہیں نائٹینگیل آف انڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ والی آئین ساز اسمبلی کی 15 خاتون اراکین میں یہ بھی شامل تھیں۔ انھیں کانگریس پارٹی کی پہلی خاتون صدر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ حقوق نسواں کے تعلق سے ان کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ملک میں پسماندہ طبقات کے فلاح و بہبود اور ان کو سماج میں مساوی درجہ دلوانے کے لیے انھوں نے کافی جدوجہد کی۔ دستور ساز اسمبلی میں مختلف طبقوں کے درمیان مساوات سے متعلق امور زیر بحث لانے میں ان کا اہم رول رہا۔ انھیں آزاد ہندوستان کی پہلی صوبائی گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آزادی سے لے کر 1949 تک یہ اتر پردیش کی گورنر رہیں۔

13۔ سوچیتا کرپلانی

آزاد ہندوستان کی پہلی خاتون وزیر اعلیٰ کے طور پر ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ یہ 1963 سے 1967 تک اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ رہیں۔ تحریک آزادی میں سرگرم رول ادا کرنے کے علاوہ یہ مجلس دستور ساز کی رکن بھی رہیں۔ یہ آئین کو تحریری شکل دینے والی سب کمیٹی کی ممبر تھیں۔ ان کو اس بنیادی ستون کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جنھوں نے آئین کا چارٹر مرتب کیا۔

1908 میں انبالہ میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ ان کے والد سرکاری میڈیکل افسر تھے اس لیے ان کے ملک کے مختلف گوشوں میں تبادلے ہوتے رہتے تھے جس کے باعث سچیتا کرپلانی کی تعلیم بھی ملک کے مختلف شہروں میں ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں تاریخ کی پروفیسر بھی مقرر ہوئیں۔ یہ تین مرتبہ لوک سبھا کے لیے بھی منتخب ہوئیں۔ یکم دسمبر 1974 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

14۔ وجیا لکشمی پنڈت

ان کا نام بھی محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہ صرف آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن ہونے کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ ایک مدبر سیاست داں اور ماہر قانون ہونے کی وجہ سے بھی شہرت رکھتی تھیں۔ نہ صرف آزادی کی تحریک بلکہ اس کے بعد دستور سازی کے عمل میں بھی ان کا بھرپور رول رہا۔ انھیں اتر پردیش سے مجلس دستور ساز کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ 1953 میں اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کی صدر بھی رہیں۔ انھیں اقوام متحدہ کی پہلی خاتون صدر ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔ ان کی سفارتی خدمات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

ہندوستان کے سفیر کے طور پر انھوں نے مختلف ممالک جن میں روس اور برطانیہ سرفہرست ہیں، خدمات انجام دیں۔ انھیں روس میں پہلا ہندوستانی سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ یکم دسمبر 1990 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

15۔ اینی ماسکارین

انھیں کیرل کی پہلی خاتون لوک سبھا ممبر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تحریک آزادی کے دوران یہ متعدد بار جیلوں میں رہیں۔ دستور ساز اسمبلی میں یہ ہندو کوڈ بل کی کمیٹی کی رکن تھیں۔ 1902 میں ایک عیسائی کیتھولک خاندان میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ٹراونکور جسے اب تیرواننتپورم کہا جاتا ہے، یہیں پر ان کی پیدائش ہوئی۔ 1925 میں انھوں نے

ٹراونکور کے ہی مہاراجہ کالج سے معاشیات میں ماسٹر ڈگری حاصل کی بعد میں یہ سری لنکا چلی گئیں وہاں انھوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1939 میں یہ آزادی کی تحریک سے وابستہ ہوگئیں اور پورے ٹراونکور خطے میں آزادی کے لیے مہم جوئی کی۔ 1963 میں ان کا انتقال ہوا۔

□□□

Mr. Abdul Wahid
M-61, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

نازآفرین

جنسی استحصال کا معروضی جائزہ

ملک بھر میں تحفظ نسواں اور مساوات نسواں کے لیے حکومت نئی نئی تدبیریں عمل میں لارہی ہے۔ان پر ہونے والے ناروا اور بے رحم سلوک نے متعدد مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ترقی کے نام پر تنزلی عام ہے۔استحصال متعدد طریقوں سے ہورہا ہے۔ 2004/کی رپورٹ کے مطابق 29/منٹ میں ایک عصمت دری، ہر 15/منٹ میں چھیڑ چھاڑ، ہر 23/منٹ میں ایک اغوا اور ہر 75/منٹ میں جہیز کے لالچ میں ایک عورت کا قتل کیا جاتا ہے۔یہ حقیقت جتنی سفاک ہے اتنی ہی تشویش ناک بھی ہے۔

کم عمر بچوں کے ذریعے انجام دیے جانے والے جرائم میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہورہا ہے۔National Crime Record Bureau کی ایک رپورٹ کے مطابق سال 2003 میں جہاں 33,320/معاملات سامنے آئے ہیں وہیں سال 2014 میں اس کی رفتار 42,566/تک پہنچ گئی ہے۔قابل افسوس اور شرم ناک بات یہ ہے کہ جنسی زیادتی کے معاملوں میں 30% کا اضافہ ہوا ہے۔سال 2014 میں جنسی زیادتی کے 2144/معاملے صرف نابالغوں کے ذریعے انجام دیے گئے ہیں۔ان ملزمین پر مقدمہ بھی دائر کیا گیا، جب کہ سال 2003 میں نابالغوں پر جنسی زیادتی کے 535/معاملے درج کیے گئے تھے۔گزشتہ سال جو سانحات ہوئے ان پر ایک نظر ڈالیے:

سال 2012 میں نربھیا حادثہ میں نابالغ کے ذریعہ کی گئی وحشیانہ حرکت کے بعد ہی نابالغوں کے لیے بنائے گئے قانون میں ترمیم کی مانگ شروع ہوئی تھی۔لیکن اس کے بعد جو رپورٹیں سامنے آئیں ان میں جنسی زیادتی کے مقابلے میں 2014 میں تقریباً دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ NCRB کی رپورٹ کے مطابق سال 2014 میں صرف زنا بالجبر کے 2144/معاملوں میں 18/سال سے کم عمر والوں کے نام درج کیے گئے۔ان میں سے 1488/معاملوں میں مجرموں کی عمر تقریباً 16/سال سے 18/سال کے درمیان تھی۔وہیں اس جرم میں سال 2012 میں 1316/نابالغوں کو زنا کے بعد مقدمے میں گرفتار کیا گیا۔2017 میں اس کا گراف 563 تھا۔NCRB کے مطابق 2016 میں جنسی زیادتی کی تعداد 13803 ہے۔سال 2012 سے رواں سال میں اس قدر اضافے ہوئے کہ غیر

ملکی میڈیا نے ہمارے ملک کو خواتین و بچیوں کے لیے غیر محفوظ قرار دے دیا۔ گویا 2012 سے 2018 میں بارہ سے پندرہ منٹ کے اندر ایک بچی کی عصمت دری کی جاتی ہے۔

ہندوستان کا قانون

ہر ملک میں جنسی جرائم میں ملوث ملزمین کو سزا دینے کے طریقے میں تھوڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں 18/سال سے کم عمر کے لوگوں کو نابالغ قرار دیا جاتا تھا اب 16/سال کر دیا گیا ہے۔ ان کو جو سزا دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ صرف تین سال جیل میں گزارنے پڑتے ہیں۔ وہ بھی اس غرض سے کہ ان کی اصلاح ہو جائے اور وہ جرم سے باز آ جائیں۔ ادھر چند برسوں میں نابالغوں کی شمولیت نے حکومت کو قانون میں ترمیم کرنے پر

مجبور کر دیا ہے۔ اس ترمیم کے مطابق اگر 18/سال سے کم عمر والے نابالغ کسی سنگین جرم میں شامل ہیں تو ان کی گنتی نوجوان کے طور پر کی جائے گی۔ موجودہ ترمیمات کے مطابق 12 سال سے کم عمر لڑکی کی اجتماعی آبروریزی کی سزا عمر قید یا سزائے موت ہوگی۔ 16- 12 برس کی لڑکی کی عصمت دری پر 20-10 سال کی قید ہوگی۔ اس میں اجتماعی طور پر ملوث مجرم کو عمر قید ہوگی۔ اس سے زیادہ عمر کی خاتون کے ساتھ زنا بالجبر میں 10-07 سال کی سزا مقرر کر دی گئی۔ مذکورہ جنسی جرائم میں تحقیقات و مقدمات کے لیے دو ماہ متعین کیے گئے ہیں۔ یہ مدت بھی مظلوم اور اس کے لواحقین کے لیے اذیت ناک ہوتی ہے۔ انصاف تو منٹوں کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس سزاؤں کا نفاذ نہیں ہوتا ہے۔

امریکہ کا قانون:

امریکہ میں سنگین جرم میں زیادہ تر صوبوں میں مجرمین کی عمر تقریباً 15-13/سال کے درمیان ہوتی ہے۔ سنگین معاملوں میں بچوں کی عدالت سے مقدمہ عام عدالت میں منتقل کر دیا جاتا ہے، جب کہ انڈیانا، ساؤتھ ڈکوتا اور ورمانٹ میں سنگین جرائم کرنے والوں کی عمر کا تعین 10 سال مقرر کیا گیا ہے۔ وہاں 18/سال سے بھی کم عمر مجرمین کے لیے عمر قید کی سزا مقرر ہے۔

برٹین کا قانون:

برٹین میں 18/سال سے کم عمر کے مجرمین کے لیے الگ عدالت ہے۔ وہاں قتل، جنسی زیادتی جیسے سنگین جرائم میں مقدمہ عدالت عام میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ملزمین کو جرم ثابت ہونے کے بعد سزا بھی دی جاتی ہے۔

چین کا قانون:

چین میں 16/سال کے بچوں کو سنگین جرائم میں جان بوجھ کر شامل ہونے پر مجرم شمار کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ 14/سے 18/سال کے ملزمین کو بڑوں کے مقابلے میں آسان اور ہلکی سزائیں دینے کے قانون پر عمل کیا جاتا ہے۔

فرانس کا قانون:

فرانس میں نابالغ کی عمر 16/سال تک ہے۔ یہاں بچوں کے لیے الگ عدالت ہے۔ سال 2002 میں فرانس نے اپنے قانون میں ترمیم کر کے یہ سختی برتی ہے۔

سعودی عرب کا قانون:

سعودی عرب میں قتل اور زنا جیسے سنگین جرائم میں کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ وہاں ان وارادات میں ملوث ملزمین کو بالغ ہو یا نابالغ اس جرم کے لیے موت کی سزا دی جاتی ہے۔

12/سال سے 16/سال کے مجرمین:

National Crime Record Bureau کے 2014 کی تحقیق کے مطابق گزشتہ سال 12 سے 16 سال کی عمر کے کل 10,534 ملزمین کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان میں 10,258 لڑکے اور 276 لڑکیاں شامل ہیں۔ ان میں 504 لڑکے قتل یا اس کی کوشش کے جرم میں گرفتار کیے گئے۔ پچھلے سال 12 سے 16 سال کی 13 لڑکیوں کو اسی کوشش کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔

اب تک جنسی زیادتی کے معاملوں میں جو رپورٹیں سامنے آئیں ہیں ان کے مطابق ہر ریاست میں روزانہ 24 گھنٹے کے اندر چار خواتین کو زنا بالجبر کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان معاملوں کو روکنے کے لیے قومی اور ریاستی **سطح پر مسلسل قانون بنائے جا رہے ہیں۔ کسی حد تک ان قوانین پر عمل بھی کیا**

جارہا ہے لیکن رپورٹ جو سچ ثابت کر رہی ہے اس کا جواب نہ تو حکومت دے سکتی ہے اور نہ ہی کوئی بورڈ؟

خواتین ولڑکیوں کے تحفظ کے لیے ریاستی سطح پر تحفظ اکائی کے علاوہ خواتین کے سیل نمبر اور بہت سارے ٹیلی فون نمبر بھی موجود ہیں جو فوری اقدامات کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ یہ ساری سہولتیں اس لیے صنف نازک کو مہیا کرائی جارہی ہیں کہ سانحہ کی رپورٹ درج کی جا سکے۔ غور طلب رہے کہ ان میں سے کچھ حفاظتی آلات اس وقت کے لیے ہیں جب مجرم واردات کو انجام دے تو اس کے خلاف شکایت درج کرائی جائے۔ جب کہ حفاظتی اقدامات چاک و چوبند رہے تو اس طرح کی وارداتیں خصوصاً زنا بالجبر کے واقعات میں بہت جلد کمی آئے گی۔ یہاں سب سے اہم وجہ اخلاقی قدروں کا فقدان ہے، جو ان جرائم کو ہوا دینے کا کام کر رہی ہے۔ اگر یہ بات غلط ہے تو پھر NCRB اور CID کی رپورٹ جو ثابت کر رہی ہیں اس کا جواب کیا ہے؟ CID کی رپورٹ کے مطابق سات سے آٹھ ماہ میں ایک ریاست میں 905 خواتین، لڑکیوں اور نابالغوں کے ساتھ زیادتی کی واردات ہوتی ہے (ان میں ڈائن، جہیز اور زنا شامل ہیں)۔

CID دہلی کی حکومت قتل اور زنا جیسے سنگین جرم میں ملوث نابالغوں کی اوسط عمر کی حد 15 سال کرنے کی وکالت کر رہی ہے، جب کہ لوک سبھا میں بچوں کے قانون میں ترمیم بل 2014 پاس ہو چکا ہے۔ نئے قانون کے مطابق اب نابالغ کی عمر 18 سال کی جگہ 16 سال مانی جائے گی۔ اس فیصلے کو بھلے ہی ابھی قانونی شکل نہیں دی جا سکی ہو لیکن NCRB کے ڈاٹا کے مطابق نابالغوں کے ذریعے انجام دیئے جا رہے ہیں۔ جرائم کو روکنے کے لیے جلد قانون بنانا ہوگا۔

گھریلو ناچاقی کی بڑھتی وارداتوں اور خود کفیل بننے کی چاہت میں ہندوستان میں تنہا رہنے والی خواتین کی تعداد میں مسلسل اضافے ہو رہے ہیں۔ ان میں غیر شادی شدہ، بیوائیں اور مطلقہ شامل ہیں۔ National Forum for Single Women کی President نرمل چندیل کی رپورٹ 2011 کے مطابق، ازدواجی زندگی میں نباہ نہیں ہونے کی وجہ سے خواتین تنہا رہنا زیادہ پسند کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے کیریر کو بہتر بنانے کا خواب بھی صنف نازک کو تنہائی کے حوالے کرنے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ گذشتہ دس برسوں میں تنہائی کی شکار ہوئی خواتین کی تعداد 39 فیصد بڑھی ہے۔ اکیلی رہنے والی خواتین کی تعداد 2011 میں 7.11 کروڑ تھی۔ تنہائی پسند کم عمر لڑکیوں کی تعداد تقریباً 1.70 کروڑ ہے۔

اس طرح طبقہ نسواں کے ساتھ ہر روز جنسی استحصال کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں اسلامی قانون کی پیروی کی جائے تا کہ عربستان کی طرح ہندوستان میں بھی جنسی استحصال کے خلاف سخت سے سخت سزا مقرر کی جائے۔ مرد و زن دونوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ فرد کے لحاظ سے ہر اعتبار سے دونوں جنس میں مساوات ہونا چاہیے۔ کسی ذات پر ظلم ہو تو دوسری ذات اس کی مدد کرے تا کہ عدل وانصاف کا نظام قائم ہو۔

❑❑❑

Naaz Aafreen
Opp. Jama Masjid
Bariatu
Ranchi-834009(Jharkhand)

مہر فاطمہ

وحید الہ آبادی کی شاعری میں تصوف

وحید الہ آبادی اردو کے واحد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے دیوان کی حفاظت کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے عظمت سخن کا نیا باب رقم کیا۔ انھوں نے اپنے کلام کو بچانے کے لیے موت کو گلے لگالیا، دیوان تو محفوظ رہا لیکن صاحب دیوان نہ رہا۔ بقول مصحفی:

دنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفی
ایک یادگار اپنا دیوان رہ گیا

وحید الہ آبادی انیسویں صدی کے اس سنہرے دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں باکمال اور استاد شعرا کی ایک کہکشاں موجود تھی مثلاً شاہ نصیر، ناسخ، آتش، ذوق، غالب، مومن، ظفر اور داغ وغیرہ۔ جہاں یہ شعرا اردو غزل کو اپنی مشاقی، تخیل اور شاعرانہ صلاحیت سے چار چاند لگا رہے تھے وہیں وحید الہ آبادی کا نام شہرت کی بلندی کو چھو رہا تھا۔ وحید الہ آبادی نے ابتدا میں مرزا حیدر علی آتش اور بعد میں بشیر علی بشیر سے مشورہ سخن کیا۔ وحید الہ آبادی خود بھی کثیر التلامذہ استاد فن تھے۔ اکبر الہ آبادی نے بھی ان سے ہی اصلاح لی:

استادی وحید میں جس کو کلام ہو
تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

وحید الہ آبادی کی غزلوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے موضوعات روایتی تو ہیں لیکن اس میں خاصا تنوع ہے۔ ان کے غالب موضوعات میں حسن وعشق کی باتیں، معشوق کے جور وستم اور معشوق کا سراپا وغیرہ خاص ہیں۔ اس کے علاوہ تصوف، زندگی کی بے ثباتی، سفر، حب الوطنی، ہنگامۂ غدر، وحشت اور خمریات وغیرہ سے متعلق اشعار بھی ان کے کلام میں وافر تعداد میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے، یہ روایتی موضوعات ہیں، لیکن انھیں وحید الہ آبادی نے جس خوبی اور تازگی کے ساتھ بیان کیا ہے، اسے دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ غیر معمولی خلاقانہ صلاحیت کے مالک تھے۔ ان موضوعات کو انھوں نے بخوبی نبھایا بھی ہے اور ہر جگہ قادر الکلامی کا ثبوت بھی دیا ہے۔

صنف غزل صرف حسن وعشق اور ان کے معاملات وکیفیات کی ترجمانی ہی تک محدود نہیں رہی ہے، بلکہ اس میں دیگر موضوعات بھی شامل رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم موضوع تصوف ہے۔ تصوف کی اگر تعریف کی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ تصوف ایک نظام حیات ہے جو انسانی قلوب واذہان کو دنیاوی آلائشوں سے پاک کر کے اخوت ومحبت اور عمل و رواداری کو جنم دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تصوف تزکیۂ نفس اور باطنی تطہیر کا نام ہے۔ چونکہ تصوف کا بنیادی مقصد تزکیۂ نفس اور قرب خداوندی ہے۔ چنانچہ یہ ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ تصوف کو کسی نے افلاطونیت سے ماخوذ بتایا تو کسی نے بدھ مت سے۔ کسی نے یونانی فلسفہ کو اس کی بنیاد قرار دیا تو کسی نے اسے رہبانیت کا پیش خیمہ بتایا اور کسی نے اسلام کو اس کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس سے قطع نظر دنیا کے تمام مذاہب

نے اس کو اپنے اپنے طور پر اپنایا اور انسان کو اخوت ومحبت اور عمل ورواداری کا درس دیا اور قلب ونظر کی آلودگی سے پاک کر کے بندے کو خدا سے ملایا۔

عربی وفارسی میں تصوف کی ایک عظیم روایت رہی ہے۔ تصور عشق نے فنا وبقا، تسلیم ورضا، صبر وشکر، ہجر ووصال کو معنویت بخشی۔ فارسی شعرا نے تصوف کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ فارسی کے پہلے شاعر سعید ابوالخیر سے لے کر سنائی، اوحدی، عطار، رومی، سعدی اور حافظ جیسے عظیم المرتبت شعرا نے ایک صحت مند روایت کی بنیاد ڈالی۔ فارسی شاعری نے مئے تصوف کو دو آتشہ بنا دیا۔ فارسی کے زیر اثر اردو شاعری کی ابتدا سے ہی تصوف شاعری کا اہم موضوع رہا۔ صنف غزل میں تصوف نے موضوعات کا تنوع اور خیال کی رنگا رنگی پیدا کی۔ اس کو گہرائی اور سنجیدگی سے آشنا کیا۔ رفتہ رفتہ تصوف کے مختلف مسائل اردو غزل کا اہم جزو بن گئے۔ تصوف کے مسائل کی ترجمانی غزل میں نئی زندگی پیدا کرتی گئی۔ اس کے سہارے اس میں نئی امنگوں اور ولولوں کے چراغ روشن ہوئے اور تصوف کے متعلق کہا گیا کہ "برائے شعر گفتن خوب است"۔ یہ کہنا کہ برائے شعر گفتن خوب است کہیں سے بھی غلط نہیں۔ تصوف نے غزل کی صحیح فنی اور جمالیاتی اہمیت ذہن نشین کرائی اور اس میں اپنے آپ کو پانے، اپنی حیثیت کو پہچاننے اور اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کا احساس وشعور پیدا کیا۔ اس نے غزل کی صنف کو حیات وکائنات کے مسائل سے آشنا کیا اور اس طرح اس میں ایک فلسفیانہ مزاج پیدا ہوا۔ چنانچہ ابتدا سے آج تک غزل کے ہر شاعر نے کسی نہ کسی حد تک اس کو اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً ابتدا سے دیکھیں:

ولی جن کو اردو شاعری کا "باوا آدم" کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا غالب رجحان تصوف نہ سہی مگر ایک اہم رجحان ضرور ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں تصوف کی وہ تمام روایتیں موجود ہیں جن کی کڑیاں فارسی کے متصوفانہ اشعار سے جا ملتی ہیں:

تجھ حسن عالم تاب کا جو عاشق وشیدا ہوا
ہر خوبرو کے حسن کے جلوے سوں بے وا ہوا

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کر بلبل ہوں ہر ایک غنچہ دہاں کا

مسند گل منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ولی عشق مجازی کو عشق حقیقی کا اول زینہ قرار دیتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ولی کے ہم عصر سراج اورنگ آبادی کے یہاں تصوف سے زیادہ گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ سراج کے نہاں خانہ دل میں جو ہنگامہ برپا تھا وہی عشق وسرمستی کا بے قرار نغمہ بن کر ان کی شاعری میں ظاہر ہوا۔ جذب وسرمستی کے عالم میں جو راگ الاپا وہ نغمہ سرمدی بن گیا:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

میر کے بارے میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صوفیوں سے زیادہ قریب تھے لیکن یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ میر کے یہاں بھی متصوفانہ خیالات بہ کثرت ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں درد وغم، رنج والم اور عشق ومحبت کا ذخیرہ ہے۔ ان کو عشق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا:

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر گیا ہے عشق

میر کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

میر کے احساس کی شدت اور اس کے ساتھ گہرے انسانی شعور نے ان میں ایک آفاقی اور کائناتی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اس لیے ان کا اثر ہمہ گیر ولازوال ہے، عشق وعاشقی کی مختلف کیفیات اور جذبات واحساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ میر کی غزل میں تصوف اور اس کے مسائل کی ترجمانی بھی کم نہیں ہے۔

(غزل اور مطالعہ غزل، عبادت بریلوی، ص 273)

چند شعر۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا
تھا وہ تو رشک بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا
دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

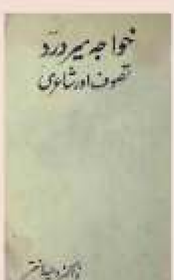

خواجہ میر درد متصوفانہ شاعری کی اس روایت کے امین ہیں جو فارسی

شاعر عطار، رومی اور جامی کے ذریعہ اردو میں منتقل ہوئی۔ شاعری درد کے نزدیک ذریعہ معاش تھی نہ باعث عزت، بلکہ دلی جذبات وکیفیات کا برملا اظہار شاعری کا سبب بنا۔

درد نے جس طرح مضامین معرفت وسلوک وتصوف کو شاعری میں سمویا اس کی مثال اردو شاعری میں تو کم سے کم نہیں مل سکتی۔

(خواجہ میر درد تصوف اور شاعری، وحید اختر، ص 229)

یہ قول مبالغہ آمیز ضرور ہے لیکن کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ درد نے عام لفظوں اور سادہ انداز میں تصوف کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو بہ آسانی سمویا ہے۔

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

غالب کے یہاں مسائل تصوف کو جس قدر فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا گیا اس کی مثال اردو شاعری میں نایاب ہے۔ غالب کی بادہ خواری نے انھیں ولی بننے سے باز رکھا۔ کہتے ہیں:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب مسائل تصوف کو قرآن وحدیث کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بلاشبہ کلام غالب میں جو معنویت اور تہہ داری ہے وہ کسی اور کے یہاں موجود نہیں۔ غالب کے یہاں متصوفانہ مباحث کو دیکھتے ہوئے بعض نے انھیں صوفی ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ مصطفیٰ صابری لکھتے ہیں:

غالب کے صوفیانہ اشعار فی الحقیقت گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں۔

(غالب اور تصوف، سید محمد مصطفیٰ صابری، ص 12)

اشعار دیکھیے:

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کردیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

خواجہ حیدر علی آتش نے لکھنؤ کی رنگین فضا میں رہ کر بھی صوفیانہ زندگی بسر کی۔ آتش کو تصوف سے قلبی لگاؤ تھا اور صاحب حال صوفی تھے۔ کلام میں جگہ جگہ تصوف کے مسائل کو بڑی خوبصورتی سے پرویا ہے:

کون عالم میں ہے ایسا جو نہیں سر بسجود
کس کی گردن کو جھکاتا نہیں احساس ترا
ماسوا تیرے نہیں رہنے کو کچھ یاں باقی
جو ہے فانی ہے تیری ذات الا باقی

وحید الہٰ آبادی کا کلام دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں دو قسم کے رنگ زیادہ غالب ہیں۔ ایک صوفیانہ اور دوسرا عاشقانہ، وحید الہٰ آبادی کو آتش سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وحید کو ناقدین نے سلسلۂ آتش کی اہم کڑی قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ابو سعید نور الدین لکھتے ہیں:

سادگی اور صفائی، جو آتش اور سلسلۂ آتش کی خاص خصوصیت ہے، وہ وحید الہٰ آبادی کے کلام کا بھی جوہر ہے اس لیے وحید الہٰ آبادی کو سلسلۂ آتش کی ایک اہم اور نمایاں کڑی تسلیم کرنا چاہیے۔

(مضمون :وحید الہ آبادی ایک تعارف، ابو سعید نور والدین، مشمولہ: وحید العصر حضرت وحید الہ آبادی، ص 165)

وحید صوفی منش اور نہایت متقی پرہیزگار شخص تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ ایک بزرگ سے بیعت بھی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تصوف کے تمام مسائل واشگاف نظر آتے ہیں۔ نثار احمد فاروقی کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

وحید کی شاعری مصحفی کے رنگ میں درد واثر سے خالی نہیں اور ان کی اندرونی کیفیات واحساسات کا آئینہ ہے۔ مصحفی کے طرز کی یہ خصوصیت کہ اس میں ایک داخلی فضا رچی ہوئی اور لہجے کی متانت بھی غیر متوازن نہیں ہوتی، وحید کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ وحید پر تصوف کا بھی غلبہ ہے وہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور صاحب حال بزرگ تھے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ حقیقت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔

(مضمون: وحید الہ آبادی، نثار احمد فاروقی، مشمولہ: آج کل، مارچ 1957)

اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے افسر امروہوی رقمطراز ہیں:

اردو شعرا میں بہت کم ایسے ہیں جن کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ موجود نہ ہو، خصوصاً وہ بزرگ جن کو مبداء فیض سے چشم بینا و دل بیدار عطا ہوا ہے، ہر ذرے میں آفتاب اور ہر قطرے میں دریا کا تماشا دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں تمام ظاہر علوم جو صورتاً مختلف ومتباین نظر آتے ہیں درحقیقت ان کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ وحید نے اس مسئلے کو بڑے ہی سلیس انداز میں بیان ہے۔

وحید الہٰ آبادی کی شاعری معرفت سے بھرپور ہے۔ ان کے اشعار

میں عشق حقیقی کی چاشنی موجود ہے۔ بیشتر اشعار میں تصوف کے معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔مثالیں دیکھیے:

ہر جگہ جب وہی ہے خود موجود
پوچھنا کیا ہے اور کہنا کیا
سب خودی کے لیے ہیں اتنے حجاب
بے خودوں سے ہے اس کو پردہ کیا

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وحیدالہ آبادی تصوف کے عقیدۂ ''وحدت الوجود'' کی طرف مائل تھے جو عام طور پر فارسی اور اردو شاعری میں مروج رہا ہے۔وحدت الوجود کے ماننے والوں کا نظریہ ہے کہ ہر شے میں خدا ہی کا جلوہ ہے اور وہ ہر شے میں جاری وساری اور ہر شے پر حاوی ہے۔ وہ ذرہ ذرہ میں جلوہ نما ہے ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی۔ رنگ، بواور نور کی شکل میں وہی اور صرف وہی ہے۔اس کا ظہور مکان میں بھی ہے اور لامکان میں بھی۔وحید کو ہر شے مظہر ذات خداوندی نظر آتی ہے۔

یہ آئینہ خانہ ہے کس کا کہتے ہیں جسے سب لوگ جہاں
آتا ہے نظر ہر سمت وہی ہوتا ہے جو معلوم ایک طرف

وحیدالہ آبادی کے یہاں متعدد ایسی غزلیں ہیں جن میں تسلسل مضمون پایا جاتا ہے۔ان میں سے بعض تصوف کے رنگ میں ہیں مثلاً:

ترا طرۂ مشک سا بھی ہمیں ہیں
تری نگہت جانفزا بھی ہمیں ہیں

یہ دل بھی ہمیں دلربا بھی ہمیں ہیں
نگہ بھی ہمیں ہیں ادا بھی ہمیں ہیں

یہ غزل تصوف کے رنگ میں ہے۔اس میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ سادہ اور سلیس انداز میں اس کی ترجمانی کی گئی ہے۔پوری غزل ایک بے خودی کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔جگہ جگہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں:

پاتا ہوں اسی کا میں نشاں دل میں بھی اپنے
جس نور سے دیر وحرم آباد ہوئے ہیں

راستہ اس نے اپنے گھر کا وحیدؔ
سچ ہے ہر رہگزر میں رکھا تھا

خودی کی تلاش اور محبوب حقیقی کو خود میں پالینے کا درس یوں دیتے ہیں۔

اسے تو آپ ہی میں ڈھونڈھا اگر اے دل طلب ہے کچھ
اسی انساں میں سب کچھ تھا اسی انساں میں سب کچھ ہے

آگے کہتے ہیں۔

لیے پھرتی تھی جب دیر وحرم میں دل کی بے تابی
تجھی کو ہر جگہ پر جلوہ فرما دیکھتے تھے ہم

اصغر گونڈوی بھی شراب معرفت سے سرشار تھے۔ان کے نزدیک ماسوا کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے

جبکہ وحید کو ہر شئے میں مظہر ذات خداوندی ہی نظر آتا ہے۔

یہ آئینہ خانہ ہے کس کا کہتے ہیں جسے سب لوگ جہاں
آتا ہے نظر ہر سمت وہی ہوتا ہے جو معلوم ایک طرف

یا

رنگ و نقاش ہی ہر جا نظر آیا آخر
نقش اول ہی نے ہر نقش مٹایا آخر

اس طرح وحیدالہٰ آبادی کے کلام میں جگہ جگہ تصوف کی چاشنی موجود ہے اور شراب معرفت کی سرشاری اس طرح بیان کرتے ہیں:

وہ جام ہوں کہ لبالب شراب عشق سے ہوں
وہ شیشہ ہوں کہ مئے شوق سے بھرا ہوں میں

وحیدالہٰ آبادی پر آج تک جتنا بھی لکھا گیا ہے اس میں اس طرف ضرور اشارہ ہے کہ وہ صوفی منش آدمی تھے جس کی وجہ سے ان کے یہاں تصوف کا غلبہ ہے۔کلام کے مطالعے سے یہ بات بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔خود کہتے ہیں:

نظر نہ جائے گی اب اپنی ماسوا کی طرف
خراب ہو کے بہت آئے ہیں خدا کی طرف

❑❑❑

Mahar Fatima
Flat No. F-3, Ist Floor
R-314 Sara Apartment
Near Quadri Masjid
Jogabai Extn.Batla House
New Delhi-110025

تبسم پروین

اہم شعری اصناف میں ہندوستانی تہذیب

یوں تو زمانے کے مطابق انسان میں مختلف قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، یہ تبدیلیاں منفی بھی ہو سکتی ہیں اور مثبت بھی۔ یعنی انسان وقت اور حالات کے مطابق خود کو بدلتا رہتا ہے، اور یہ تبدیلیاں اس کے زمانے کے مطابق ہوتی ہیں۔ مثلاً طریقہ رہائش، رسم ورواج، ماحول، کھانے پینے کے آداب وغیرہ، اسی سے اس کے عہد کی پہچان اس کی خصوصیت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور وہ اس دور کی تہذیب بن جاتی ہے۔ مثلاً ہم مغلوں کے عہد کی عمارتوں، باغوں اور تصویروں کو مغلیہ تہذیب کی علامت کہتے ہیں۔ اس طرح جب انسان ان چیزوں کو دیکھ کر جو تجربے حاصل کرتا ہے اس پر وہ ایک رائے قائم کر لیتا ہے اور پھر وہ اپنے ردعمل کا اظہار ادب کی صورت میں کرتا ہے۔ ادب اور تہذیب کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ دنیا میں ہر مہذب معاشرہ نے اپنی زبان میں ادب کی تخلیق کر کے اپنی تہذیبی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے فرائض انجام دیے ہیں۔ تہذیب ایک مسلسل اور ہمیشہ جاری رہنے والا عمل ہے، جو انسانی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا کی عظیم قوموں نے تہذیبی ارتقا کے کسی بھی مرحلے میں ادب سے غفلت نہیں برتی ہے۔ ہر عہد میں مہذب قوموں نے اپنے عظیم تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو آئندہ نسلوں کے لیے ادب پاروں میں محفوظ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ اردو ادیبوں نے ہندوستانی فضا کے مسائل کو اپنا موضوع قرار دیا۔ اس لیے شعروادب کو معاشرتی زندگی میں اہم مقام حاصل ہے کسی ملک اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف اداروں اور شعبوں کا عکس اس کے ادبیات میں جھلکتا ہے۔ سیاسی وسماجی اداروں کی کارکردگی کے جو نتائج ظہور میں آتے ہیں، ان کا جائزہ بالآخر مفکر، ادیب اور شاعر ہی لیتے ہیں۔ اس طرح تہذیب کی بدولت نہ صرف ہم عہد کو بخوبی جان سکتے ہیں بلکہ عہد کے بدلتے رجحانات کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

ہر زبان کا ادب اپنے سماج میں اتری ہوئی جڑوں کو کسی نہ کسی صورت میں ضرور پیش کرتا ہے۔ کسی قوم کے کلاسیکی ادب پاروں میں اس قوم کا تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ محفوظ ہوتا ہے جو انھیں تہذیبی روایات کو تسلسل عطا کرنے کے علاوہ ہم عصر سماج کی ذہنی تربیت اور وقار بھی عطا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہذب سماجی گروہ کے باشعور اور ذہین افراد نے ادب کو ہمیشہ گہری توجہ کا مستحق سمجھا ہے۔ چنانچہ ایسی قوموں کے باشعور اور ذہین افراد ہمیشہ ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں وہ ادب کے آئینے میں اپنے باطن کی تلاش کر کے اپنی آرزوؤں، امنگوں اور تمناؤں کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔ اردو زبان وادب کو ہندوستانی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ نظیرؔ اکبرآبادی کی شاعری عوامی شاعری کہلاتی ہے اس میں ہر طبقے کی تہذیب، معاشرت، معیشت، رہن سہن کے طور طریقے اور کردار کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا کلام اپنے دور کی تہذیبی تاریخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالی نے بھی زبان وتہذیب کو نئی وسعتیں عطا کیں۔ حالیؔ صرف مسلمانوں کے مصلح نہیں بلکہ تمام ہندوستان اور ہندوستانی سماج کے مصلح تھے۔ انھوں نے جہاں ایک طرف 'مسدس مدوجزر اسلام' لکھی وہیں 'مناجات بیوہ'، 'چپ کی داد' لکھ کر ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کو اجاگر کیا۔ علامہ اقبالؔ ایسے فلسفی شاعر گزرے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ

ہندوستان میں اسلامی فکر کو نئی سمت دی۔ ان کی نظر میں وہی تہذیب اس دور کے لیے مفید ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو ایک لڑی میں پیوست کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو مرثیہ ہندوستانی معاشرت بالخصوص لکھنوی معاشرت اور بیگمات کے انداز گفتگو اور طرز بیان کی ترجمانی کرتی ہے اور یہ خصوصیات میرانیس کے مرثیوں میں صاف نظر آتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے قاسم جہاد پر روانہ ہونے سے پہلے اپنی دلہن سے بات چیت کرتا ہے۔ اس بات چیت میں ہندوستانیت کی گہری چھاپ ہے۔ اس دور کی ہندوستانی تہذیب کا پروردہ نازوں کا پالا نو عمر دولہا ہے جو اپنی دلہن سے بات منوانے کی خاطر سب کچھ کرسکتا ہے۔ مثلاً

دولہا نے جو دیکھا کہ دلہن غم سے ہے مضطر
جھک کر کہا زانو سے اٹھاؤ تو ذرا سر

للہ نہ روؤ تمھیں سمجھاتے ہیں صاحب
کچھ بات کرو مرنے کو ہم جاتے ہیں صاحب

جس وقت سنی درد کی تقریر یہ ساری
تادیر تو بولی نہ دلہن شرم کی ماری
دولہا نے رکھا پاؤں پہ جب سر کئی باری
آہستہ کہا آہ! یہ تقدیر ہماری

سمجھی میں یہ بس مجھ کو نہ سمجھایئے صاحب
کیا زور مرا، خیر چلے جایئے صاحب

(میر انیس)

اس بند سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انیس لکھنوی رسم و رواج سے اتنے متاثر تھے کہ قاسم جیسے بہادر کا سر دلہن کے پاؤں پر رکھوا دیتے ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ کتنا بڑا اور قادر الکلام شاعر ہی کیوں نہ ہو اپنے ماحول کے اثرات سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اس دور کے مرثیوں میں ہندوستانی تہذیب کے ہزاروں جلوے اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ اس عہد کے مرثیوں میں نہ صرف رسم و رواج بلکہ بچپن سے لے کر موت تک کے تمام مراحل، کاجل لگانا، نظر بد کا ٹیکا لگانا، بلائیں لینا، گھونگھٹ کا رواج، قبروں پر جانا، چراغ روشن کرنا وغیرہ سبھی تہذیبی عناصر کی تصویریں جا بجا دکھائی دیتی ہیں۔ پھر جب جوش، جمیل مظہری، وحید اختر، عشرت رضوی کے مرثیوں کا دور آتا ہے تو ان کے مرثیوں میں آزادی کی جدوجہد، ظلم کے

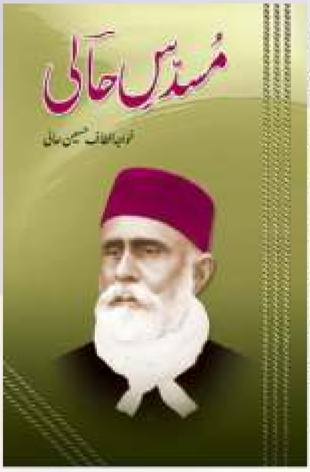

خلاف احتجاج کرنے، بدترین حالات میں بھی حوصلہ رکھنے اور روایتی انداز میں کربلا کو پیش نہ کرکے دور جدید کی پریشانیوں میں مشعل راہ کے طور پر پیش کرنا ہے۔ سودا اور ذوق نے درباری مداحی میں قصیدے کہے تو دوسری طرف ہجو یہ قصائد کے ذریعے انھوں نے اس دور میں دہلی کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات کو طنز کا نشانہ بنایا۔ قصیدہ 'در ہجو اسپ' دراصل زوال پذیر مغلیہ حکومت کے عسکری نظام پر طنز ہے اور گھوڑے کی ناتوانی اور لاغری ایک کمزور سلطنت کی بے طاقتی کا مظہر ہے۔

ناطاقتی کو اس کی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

(سودا)

لہٰذا اس دور کے قصائد کے مطالعے سے دلی کی ویرانی، ابتری، بے زری، بربادی اور تباہی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ان فنکارانہ ہجو یہ تخلیقات کو پڑھ کر آخری مغل تاجداروں کی لٹتی ہوئی شان و شوکت، معاشی خستہ حالی اور سماجی ابتری کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہجو یہ قصائد دہلی کی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں 1857 کے بعد سے زندگی کے مختلف شعبوں میں انقلاب رونما ہونا شروع ہوا۔ بدلے ہوئے حالات سے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ بھی بدلنے لگا۔ یعنی شہنشاہیت اور جاگیرداری کے خاتمہ کے ساتھ تہذیب و تمدن میں بھی تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں۔ درباداری کے خاتمے سے وہ زریں مواقع ختم ہوگئے جو حصول انعام و اکرام کا ذریعہ تھے، جس کا اندازہ اٹھارہویں صدی کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی کے قصائد سے لگایا جاسکتا ہے۔ بالخصوص محسن کاکوروی نے درباری مداحی کے بجائے نعتیہ قصیدے لکھے۔ اس دور کے قصائد میں مقامی رسم و رواج، میلے ٹھیلوں کی تصویر کشی پر زور

صرف کیا اور مناظر فطرت کی عکاسی میں ہندوستانی موسم اور فضا کا خیال رکھا۔ اس طرح اردو قصائد دربار تک رسائی اور تعلق وخوشامد ہی تک محدود نہیں رہے بلکہ بڑی حد تک ان سے قومی مزاج، سماجی ساخت وحالات اور معاشرت کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں اگر غزل کی بات کریں تو غزل کا رویہ تہذیبی ومعاشرتی مظاہر میں براہ راست موضوع کی حیثیت سے بہت کم استعمال ہوا ہے لیکن اگر ہم عہد بہ عہد ان کا مطالعہ کریں تو تہذیبی ومعاشرتی حرکت کی جہت کا اندازہ کرنا ممکن ہوجاتا ہے۔ مثلاً ولی کی غزل میں مقامی اثرات خاصے غالب ہیں اس کے پس منظر میں نہ صرف ہندوستانی تہذیب کے خدوخال نمایاں ہیں بلکہ ہندی اساطیری اور دیومالائی اشارے بھی کثرت سے موجود ہیں۔ غزل میں پان اور مسی کا ذکر اکثر ملتا ہے جو خالص ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے۔ صندل کا استعمال، مہندی لگانا، راگ راگنیوں، مرغوں کی پالی، شادی اور موت سے متعلق رسوم، قبر پر چراغ جلانا، پھول چڑھانا، پیر اور مرید کا ذکر، دیگر موسمی تہواروں اور تقریبات کا ذکر، عقائد کے بارے میں کچھ حوالے وغیرہ یہ سب اشارے اور حوالے غزل کو ایک خاص تہذیبی ومعاشرتی فضا مہیا کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

پوجا کوں تجھ درس کی ہو جوگی فلک اوپر
نکلیا پہن جامۂ خاکستر آفتاب

....

دیکھے سوں تجھ لباں کے اپر رنگ پان آج
چونا ہوئے ہیں لالہ رخاں کے پران آج
(ولی)

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں
(ذوق)

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست وبازوں کو
یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
(غالب)

یہی رنگ قطب شاہی اور عادل شاہی دور میں بھی ہے۔ ولی کے دور کی غزلوں میں فارسی کی چھاپ نمایاں ہے۔ ولی کے بعد سراج دکنی اور پھر شمال میں حاتم، سودا اور میر تک بتدریج اس مقامی رنگ وبو کم ہوتے چلے جانے کے باوصف ابھی اردو غزل پر ہندی اثرات موجود ہیں اور یہی اثرات ہمیں انشا، جرأت، مصحفی، آتش، ناسخ، ظفر، ذوق، غالب اور مومن کے یہاں بھی نظر آتے ہیں۔ ابتدا ہی سے غزل میں گومتی، گنگا اور جمنا کا ذکر ملتا ہے۔ درختوں میں پیپل ہندوتہذیب کی اہم علامت ہے جسے غزل نے برتا ہے۔ اردو شاعری میں نظم، قصیدہ، مرثیہ اور غزل کے علاوہ اردو مثنویوں میں بھی ہماری ہندوستانی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کی مصوری ملتی ہے۔ شمالی ہند میں اردو مثنوی نگاری کو لکھنؤ کی فضا سب سے زیادہ راس آئی اور وہاں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں جو واقعی قابل تعریف ہیں۔ میر کی مثنوی ہوں یا میر حسن کی، نسیم کی مثنوی ہو یا پھر مرزا شوق کی ہندوستانی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ بیشتر مثنویوں کے موضوعات عشقیہ رہے ہیں، اور اس عشق کے تصور میں بھی زمانے کے مطابق تبدیلی نظر آتی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں میر کی مثنوی 'دریائے عشق' کی ہیروئن کے کردار میں سادگی، وشرم وحیا ہے۔ پردے کا رواج اور اظہار عشق میں پابندیاں نظر آتی ہیں جو انھیں محبت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس دور کے معاشرے میں عورت کا اظہار عشق سخت معیوب بلکہ مذہب اور اخلاق وفطرت سے بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے 'دریائے عشق' میں عاشق ومعشوق کو جیتے جی وصل نصیب نہیں ہوتا اور مرنے کے بعد ہی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوپاتے ہیں۔ مزید آگے بڑھیں تو میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میں جیتے جی وصل تو ہے لیکن یہاں بھی عاشق شراب کا پیالہ پینے کے بعد اظہار عشق کی جرأت کرپاتا ہے۔ عورت کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ محبت کو چھپاتی ہے اور جب اس کی چوری پکڑی جائے تو مکر جاتی ہے لیکن اظہار محبت نہیں کرپاتی۔ عورت کی یہ فطرت عہد میر کی مثنویوں میں صاف واضح ہے لیکن مرزا شوق کا دور اس فطرت سے منفرد نظر آتا ہے۔ جب ہم مرزا شوق کی مثنوی زہر عشق کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے حوالے سے ہمیں تصور عشق میں ایک ارتقائی صورت حال نظر آتی ہے۔ جذبات عشق میں عاشق کو خط لکھ دینے سے اظہار محبت کی پہل لڑکی کی طرف سے ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں لڑکیوں کی یہ بے زبانی، گھٹن، اظہار جذبات پر پابندیاں کچھ کم ضرور ہوئیں لیکن ختم نہیں ہوئیں۔ اگر ایسا ہوجاتا تو وہ رسوائی اور بدنامی پر موت کو ترجیح نہیں دیتی۔ بلکہ اسے پانے کی ہرممکن کوشش کرتی اسے اپنے گھر کی عزت کا پورا خیال ہے اس لیے خود عاشق سے کہتی ہے ۔

سامنا ہو ہزار آفت کا
پاس رکھنا ہماری عزت کا

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہرشاعر وادیب اپنے ملک کی ہندوستانی

تہذیب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ اپنی نگارشات میں اس کا ذکر بڑی محبت اور خلوص سے کرتا ہے۔ اس لیے ہر عہد کے شعری اصناف میں اس کے عہد کی ہندوستانی تہذیب کے نقوش واضح ہوتے ہیں لیکن ہر شعری اصناف سخن میں ہمیں مختلف طریقوں سے ہندوستانی تہذیب کی مصوری ملتی ہے، مثلاً غزل میں تلمیحات واشارات کی صورت میں اور قصیدے میں ہجو یا مدح، مرثیہ میں کربلا کے واقعات اور مثنوی میں ایک داستان کی صورت میں واضح ہے اس طرح کم وبیش ہر شعری اصناف سخن ہندوستانی تہذیب کی ترجمانی کرتی ہے۔ ان شعری اصناف کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سترہویں صدی کے سیاسی، سماجی، معاشی ومذہبی حالات کیسے تھے اور گزرتے وقت میں ان حالات میں کس طرح کا بدلاؤ آیا اور مزید آگے کس طرح کے بدلاؤ کی امید کی جاسکتی ہے جس سے ہمارا ملک ترقی یافتہ بن سکتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی تہذیب کے عناصر نہ صرف قصیدہ، مرثیہ، مثنوی یا غزل میں پائے جاتے ہیں بلکہ اردو ادب کی جتنی بھی اصناف سخن ہیں ان پر ہندوستانی تہذیب کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ چاہے وہ نظم کی صورت میں ہوں یا نثر کی مثلاً پریم چند کے افسانے ہوں یا انیس کا مرثیہ، میر کی غزلیں ہوں یا پھر نظیر کی نظمیں، سودا کے قصائد ہوں یا میر حسن کی مثنوی ان سب پر ہندوستانی تہذیب کا رنگ صاف دکھائی دیتا ہے، رسوا کا ناول، واجد علی شاہ کا رہس، امانت کی اندر سبھا، رنگین کی ریختی غرض اردو ادب کی کوئی بھی ایسی صنف سخن نہیں جو ہندوستانی تہذیب کے رنگ میں نہ رنگی ہو۔

□□□

Tabassum Parveen
B Block, House No. 97
Near Jama Masjid
New Seelampur
Delhi-110053

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

تقدیر کا فیصلہ

خلیق النساء

بارات آگئی، بارات آگئی۔ عورتوں اور بچوں کا ملا جلا شور، گولوں پٹاخوں کی کان پھاڑ دینے والی آوازیں سنتے ہی ساری لڑکیاں اس طرح بالکنی میں بھاگیں گویا رنگ برنگی چڑیاں ایک ساتھ اُڑی ہوں ویسے بھی لڑکیوں اور چڑیوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ ہنسنا، چہچہانا، بے فکری، کبھی ادھر تو کبھی ادھر، پل بھر میں چھت پر لمحوں میں نیچے۔ لڑکیاں بابل کے آنگن کی وہ چڑیاں ہوتی ہیں جنھیں ایک مناسب وقت پر سنہری پنجرے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ پنجرے سے ایسی مانوس ہو جاتی ہیں کہ پنجرے کا دروازہ لاکھ کھلا ہو وہ اڑنے کا سوچتی بھی نہیں۔ چار دن سے مایوں بیٹھی ماہ نور مکرم صاحب کے آنگن کی خوبصورت چڑیا ہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے جسم اکڑ گیا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ، تالیوں کی گونج، مہمانوں کا شور وغل سب نے مل کر اعصاب پر ایسا اثر ڈالا کہ بے طرح سر کے درد میں مبتلا کر دیا۔ لڑکیوں کے جاتے ہی سوچوں کے در وا ہوئے۔

مکرم صاحب انتہائی دیندار و نیک نفس انسان تھے کسی فیکٹری میں معمولی تنخواہ پر ملازم۔ قریب ہی نمبر دو کا دریچہ کھلا ضرور تھا لیکن وہ رشوت کا ایک پیسہ لینا حرام سمجھتے تھے۔ ان کی شریک حیات نعیمہ بھی شوہر سے متفق تھیں یہی خوبیاں بچوں کو وراثت میں ملی تھیں۔ سب سے بڑے سہیل جنھوں نے سال گزشتہ تعلیم ختم کی تھی پھر ماہ نور اور مہوش اور چھوٹا نوید جو ابتدائی کلاس میں تھا۔ ماہ نور بی۔ اے کر کے گھر بیٹھی رہی کہ آگے وسائل ہی نہیں تھے۔ سہیل البتہ باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جوتے گھس رہے تھے لیکن ملازمت نایاب تھی۔

ماہ نور خوبصورت، نیک سیرت اور سلیقہ مند تھی لیکن اس کے ساتھ بھی وہی المیہ تھا جو اس کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ عموماً ہوتا ہے۔ مکرم صاحب شاندار جہیز کہاں سے لاتے۔ معمولی آمدنی کے علاوہ چند بیگھہ زمین کا ٹکڑا تھا جس سے سال در سال غلہ حاصل ہو جاتا۔ رشتے آتے رہے۔ گھر کی حیثیت دیکھ کر خواتین کبھی نہ آنے کے ارادے سے رخصت ہو جاتیں۔ کسی کو اس کا حسن اور تعلیم متاثر نہیں کرتی یہ سب تو اس دور کی ثانوی چیز ہے۔ حساس ماہ نور اس نمائشی میلے سے تنگ آچکی تھی۔ آخر کار مکرم صاحب کے توسط سے مجید کے رشتے پر مہر لگ ہی گئی۔ معمولی شکل و صورت سانولی رنگت چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ایک مقامی بینک میں کیشیر تھا۔ دیکھنے میں لوگ شریف سب سے بڑھ کر جہیز کا کوئی خاص مطالبہ نہیں تھا۔ سگھڑ ماں نے برسوں سے بیٹی کے جہیز کے لیے ہلکی پھلکی تیاری شروع کر دی تھی۔ کوئی میرج ہال بک نہیں کیا گیا۔ گھر سے باہر خالی جگہ میں پنڈال لگا دیا گیا تھا۔ سہیل نے اپنے دوست ہمایوں کی مدد سے شامیانے، قناطیں اور دیگر سجاوٹ سے اسے میرج ہال کی شکل دے دی۔ ہمایوں ایک جانے مانے بزنس مین کا اکلوتا بیٹا ہونہار لائق امیری غریبی کے زبردست فرق کے باوجود اپنے قریبی دوست سہیل کو حقیقی بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ کئی موقعوں پر اس نے سہیل کی مدد کرنا چاہی لیکن سہیل کی خودداری نے کبھی قبول نہیں کی۔ سہیل کے پاس برابر آتا جاتا رہتا تھا۔ ماہ نور کے سینے میں گوشت کا لوتھڑا تھا جسے دل کہتے ہیں جو ہر خوبصورت چیز دیکھ کر مچلتا ہے لیکن بس ایک لمحے کو، وہ مشرقی لڑکی جانتی تھی کہ آسمان کا چاند خاک نشینوں

کی جھولی میں نہیں اتر سکتا۔

لڑکیاں بارات اور دولہا کا نظارہ کر کے واپس آ چکی تھیں۔ کمنٹ شروع ہو چکے تھے ماہِ نور بھی حال میں لوٹ آئی۔ '' بھئی ایمان کی بات ہے۔ دولہا ہماری ماہِ نور کا پاسنگ بھی نہیں۔ زارا نے خیالات کو الفاظ دیے۔ '' مجھے تو ساس نند بھی تنک چڑھی لگیں'' ایک اور کمنٹ '' بھئی کیوں پہلے سے میری آپی کا دل خراب کر رہی ہو'' مہوش نے دخل اندازی کی۔

'' جیسا دیکھا ویسا کہہ دیا'' زارا کو مہوش کی دخل اندازی اچھی نہیں لگی۔

'' زارا آپی آپ اچھا برا دیکھ رہی ہیں ہم مڈل کلاس فیملی کی لڑکیاں عزت سے اپنے گھر کی ہو جائیں یہ کیا کم ہے'' مہوش نے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

حسب دستور بے حد عزت و احترام سے دولہا والوں کو کھانا کھلایا گیا۔ ہر ایک چاق و چوبند تھا کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لڑکے والوں نے جہیز دیکھنے کی فرمائش کی جو برابر کے پنڈال میں سجا تھا۔ '' بھئی جہیز تو بڑا معمولی ہے کوئی قیمتی چیز نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔'' لڑکے کے ماموں کی جانب سے پہلا پتھر آیا۔ '' ضرورت کی مکمل اشیا بھی نہیں ہے۔'' یہ بھی کوئی ماموں یا چچا تھے۔

'' محترم آپ کے یہاں سے کسی قسم کی کوئی فرمائش نہیں تھی پھر بھی میں نے جو کیا ہے وہ میری حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مکرم صاحب نے نرمی سے کہا۔

'' آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ کیسی فرمائش کلر ٹی وی، فرج، واشنگ مشین، بائیک یہ تو عام ضرورت کی اشیاء ہیں۔ ہمیں فرمائش کرنا ہوتی تو کار یا فلیٹ کی کرتے۔'' لڑکے کے والد نے انتہائی سرد مہری سے کہا۔ شجاعت صاحب جن کے توسط سے رشتہ طے ہوا تھا قریب آ گئے۔

'' محترم آپ ہی سمجھایئے میں نے آپ سے پہلے ہی اپنی حیثیت واضح کر دی تھی۔'' مکرم صاحب نے کہا۔

'' اجی یہ کیا سمجھائیں گے ہمارے ساتھ سراسر دھوکا ہوا ہے۔'' کیا دھوکہ ہم نے آپ کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔ ہم اپنی خوبصورت، تعلیم یافتہ بہن کو آپ کی شرافت پر یقین کر کے رشتے پر راضی ہو گئے یہ دھوکا ہے۔''

سہیل باپ کی توہین برداشت نہ کر سکا۔ دونوں طرف کے کافی لوگ اکٹھا ہو گئے۔ مکرم صاحب کا رنگ متغیر تھا کہ دولہا کے وہی پہلا پتھر پھینکنے والے ماموں دولہا کے والد کو الگ لے جا کر سرگوشیاں کرنے لگے۔ '' ہم نے سنا ہے آپ کی کچھ زمین بھی ہے۔'' دولہا کے والد نے کہا آپ نے صحیح سنا ہے پھر؟

پھر یہ کہ ہم اس شرط پر آپ کی لڑکی کو نکاح کر کے لے جائیں گے کہ آپ اس زمین کو فروخت کر کے جہیز کی کمی کو پورا کریں گے ورنہ......''

'' ورنہ'' آگے سوچنا بھی ایک عزت دار باپ کے لیے موت سے بدتر مقام ہے۔ ٹھیک ہے اثباتی جواب تھا۔

اندر خواتین میں بھی چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ حساس ماہ نور کو لگا وہ آہستہ آہستہ زمین میں دھنستی جا رہی ہو۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک دھماکہ ہوا۔ ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں آیا اور وہ مطمئن ہو گئی۔

'' تمھیں پچیس ہزار روپیہ مہر معجّل عبید الرحمٰن کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ تمھیں قبول ہے۔'' کوئی آواز نہ پا کر گواہوں نے دوبارہ الفاظ دہرائے۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ انتظار تھا تو صرف ایک مجبور'' ہاں'' کا لیکن یہ کیا۔ '' نہیں'' ماہ نور کی آواز نے ایک خاموش طوفان کو آواز دی۔

گواہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حیرت، استعجاب، ملامت کتنی ہی نظریں اٹھیں۔ نعیمہ بیگم آگے بڑھیں۔ '' بیٹی کیا کہہ رہی ہے۔''

'' امی مجھے مہر کی رقم پر اعتراض ہے۔''

'' مہر عورت کا حق ہوتا ہے۔ تمھیں کتنے مہر پر نکاح قبول ہے۔ مولوی صاحب نے بات کو مختصر کیا

'' پانچ لاکھ'' ماہ نور نے میزائل داغا۔

'' ماہ نور ہوش میں تو ہے کیوں ہماری عزت کا جنازہ نکالنا چاہتی ہے۔'' نعیمہ بیگم نے بیٹی کو جھنجھوڑا۔ مہوش جلدی سے باپ کو بلا کر لائی'' یہ پاگل ہو گئی ہے۔'' مکرم صاحب اور سہیل نے کمرے میں قدم رکھا جو کچھ سنا وہ ناقابل یقین تھا۔ انھیں اولاد کی تربیت پر ناز تھا۔ پر کہاں کمی رہ گئی۔ سہیل البتہ خاموش کھڑا تھا۔ مکرم صاحب بیٹی کے قریب آئے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

'' ماہ نور یہ سب کیا کہہ رہے ہیں''؟ ماہ نور تڑپ کر باپ کے سینے سے لگ کر بے تحاشا رو دی'' پاپا مجھے غلط مت سمجھئے میں آپ کی عزت کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہوں، نہ میری کوئی پسند ہے۔ آپ نے جو میرے لیے سوچا میں نے سر جھکا دیا۔ لیکن جہیز کی لالچ بھری محفل میں آپ کو یہ لوگ ذلیل کریں اور دو ڈھائی بیگہ زمین کا بھی سودا کریں پاپا یہ مجھے منظور نہیں۔ وہ اپنا حق استعمال کر سکتے ہیں تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ میں اس زندگی سے مر جانا قبول کروں گی جب رخصت ہوتے ہوتے ماں باپ، بہن بھائی کے منہ سے نوالہ بھی چھین لوں۔ آپ جس کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دیں گے مجھے منظور ہے۔ آپ کی عزت سے پیاری مجھے کوئی چیز نہیں ہے۔

سیکڑوں لوگوں کے سامنے آپ کا جھکا سر نہیں دیکھ سکتی۔'' روتی بلکتی ماہ نور نان اسٹاپ بول کر باپ کے بازوؤں میں بیہوش ہو گئی۔ خاموش کھڑے سہیل نے آگے بڑھ کر اس کو آہستگی سے لٹا دیا۔

''محترم آپ کی بیٹی نے بہادری سے ایک قدم اٹھایا ہے۔ آج آپ نے زمین فروخت کرنے کا وعدہ کیا ہے کل لڑکی کو گھر لے جا کر ان کے مطالبات مزید بڑھے تو کیا آپ رہائشی مکان فروخت کر کے ان کی فرمائش پوری کریں گے اور پھر آپ کی دوسری بیٹی بھی تو ہے۔ گواہوں میں سے ایک نے کہا۔

مردانہ محفل میں آ کر گواہوں نے دولہا کے والد کے سامنے ماہ نور کے مہر کا مطالبہ دہرایا۔ پانچ لاکھ سنتے ہی وہ اپنی سیٹ سے غالباً پانچ فٹ کے قریب اچھلے۔ ''اوہ تو لڑکی کو یہ شادی منظور ہی نہیں ضرور کوئی چکر ہے۔'' ایک معصوم پارسا لڑکی کے بارے میں گل افشانی کی۔

آگے ایک لفظ نہیں ورنہ نتیجے کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے میری معصوم بہن پر الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آپ بیٹے کی شادی کر رہے ہیں یا تجارت آپ کی فرمائش پر ہم زمین بیچ دیں اور آپ پانچ لاکھ سنتے ہی آپے سے باہر ہو جائیں۔'' سہیل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ہمایوں نے آگے بڑھ کر سہیل کو روکا۔ ''پاپا چلیے ہم کہاں پھنس گئے۔ دولہا نے مسند سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی برات واپس جانے لگی مکرم صاحب جلدی سے آگے بڑھے'' بیٹا روک لو انہیں اب کون آئے گا میرے دروازے پر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا میری بچی کہیں کی نہیں رہے گی دو آنسو گر کر ان کے گریبان میں جذب ہو گئے۔

سہیل اپنے مہمانوں کو روکے رکھو میں ابھی آیا ماہِ نور آج ہی رخصت ہوگی۔ ہمایوں کے کہنے پر دونوں باپ بیٹے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آدھے گھنٹے میں شاندار سیاہ گاڑی گیٹ پر رکی ہمایوں نے اتر کر گیٹ کھولا۔ زماں خاں اور ان کی بیگم گاڑی سے باہر آئے۔ زماں خاں سیدھے مکرم صاحب کے پاس آئے علیک سلیک کے بعد وہ انھیں ایک طرف لے گئے۔ ''ہمایوں آپ کی نظر میں کیسا ہے۔'' بغیر تمہید کے استفسار کیا۔ ''لاکھوں میں ایک لیکن آپ مجھ سے کیوں دریافت کر رہے ہیں'' مکرم صاحب کی حیرت بجا تھی۔

اس لیے کہ میں اس کو آپ کی فرزندگی میں دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہے تو میں آج ہی ماہ نور کو رخصت کرا کر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''زماں خاں صاحب یہ آپ کی وسیع القلبی ہے لیکن میرا اور آپ کا کیا جوڑ ہمایوں کی سہیل سے دوستی ضرور ہے لیکن شادی بیاہ برابر والوں میں ہی ہوتے ہیں پھر آپ کا اکلوتا بچہ نہ معلوم آپ کے دل میں کیا کیا ارمان ہوں گے۔'' دولت کے آگے ایک باپ کے الفاظ سرنگوں تھے۔

''بس مکرم صاحب آگے ایک لفظ نہیں۔ دولت کی ترازو سے شرافت کو مت تولیے آپ کی بچی نے ایک مثال قائم کی ہے جہیز کے لالچیوں کے منہ پر ایک طمانچہ مارا ہے مجھے اس سے اچھی بہو نہیں مل سکتی۔ ہمایوں کی سالگرہ پر وہ ایک بار ہمارے یہاں آئی تھی ہم دونوں میاں بیوی کو وہ بیحد پسند آئی تھی لیکن آپ کے یہاں رشتہ پکا ہونے کی خبر سن کر ہم نے خموشی اختیار کر لی۔ لیکن تقدیر کا یہی فیصلہ ہے۔'' اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو میں بخوشی یہ رشتہ منظور کرتا ہوں۔'' مکرم صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔ اندر بیگم زماں روتی ہوئی ماہِ نور کو تسلی دے رہی تھیں۔ سب کچھ ویسا ہی تھا لیکن دولہا بدل چکا تھا۔ جس مسند پر عبید الرحمٰن بیٹھا تھا وہاں اب ہمایوں تھا۔ اکیاون ہزار مہر کے عوض ماہِ نور کا نکاح ہمایوں سے ہوا۔ ہر طرف مبارک سلامت کا شور تھا۔ زماں صاحب مکرم صاحب سے گلے ملے۔

''مکرم صاحب اور سہیل نے جہیز لے جانے کی بات کی۔

''نہیں بھائی ہم ایک تنکا بھی یہاں سے لے کر نہیں جائیں گے۔ یہ آپ دوسری کے لیے رکھیے۔ اصل جہیز تو خود نور بانو بیٹی ہے۔'' دیر رات ماہ نور رخصت ہوئی۔ گاڑی میں ماہ نور کے برابر بیٹھے ہمایوں نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''ماہ نور مہر قبول ہے۔'' اس کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا۔

□□□

Khaleequn Nisa
Mazar Tat Shah Miyan
Rampur-244901 (U.P)

بھرم

آسیہ رئیس خان

شوہر کو آفس اور دونوں بچوں کو اسکول روانہ کرنے کے بعد ربیعہ اپنے معمول کے کاموں میں لگ گئی تھی۔ گھر کے کام نپٹاتے ہوئے لاشعوری طور پر اس کا ذہن اطلاعی گھنٹی کی طرف تھا۔ اسے اس نئی جگہ منتقل ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے۔ وہ مزاجاً کم گو اور شرمیلی تھی اس لیے پڑوسیوں سے اس کا تعلق صرف رسمی دعا سلام تک ہی محدود تھا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اس سے نیچے والی منزل پر رہنے والی بتول آپا کا مزاج اس کے برعکس تھا۔ انھیں دوسروں کے گھر، زندگیوں اور معاملات میں دلچسپی لینے میں کمال حاصل تھا۔ وہ مقابل کی اجازت یا اس کی مرضی جیسے بکھیڑوں میں نہیں پڑتی تھیں۔ ان کے وقت بے وقت اپنے گھر میں آنے اور نان اسٹاپ بولنے پر پہلے اس نے اخلاق کا مظاہرہ کیا، پھر کوفت میں مبتلا ہوئی اور آخر میں اس معاملے میں اپنی بے بسی قبول کرتے ہوئے وہ اس ان چاہی آمد کی عادی ہوتی چلی گئی۔ دیگر خصوصیات کے ساتھ بتول آپا کی سب سے قابل ذکر خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی بلڈنگ کے ساتھ ساتھ اپنی کھڑکی سے نظر آنے والی پڑوس کی ساری عمارتوں کی نگرانی وہاں کے چوکیداروں سے زیادہ مستعدی سے کرتی تھیں۔ مکینوں کے اپنے کام دھندے، اسکول، دفتر اور کالج آنے جانے کے اوقات جیسی نصابی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی خاص دلچسپی مکینوں کی غیر نصابی سرگرمیوں میں تھی۔ کون سے فلیٹ میں سب سے زیادہ آن لائن شاپنگ ہوتی ہے، کس کے گھر میں اکثر کھانا باہر سے آرڈر کیا جاتا ہے، کس فلیٹ میں نیا ٹی وی آیا ہے اور کس نے نیا فرنیچر خریدا ہے، کس گھر کے بہو بیٹا جلد ہی الگ ہونے والے ہیں، کس کا بیٹا ہاتھ سے نکل چکا ہے، کس کے قدم غلط راستے پر پڑ چکے ہیں، کون سی لڑکی کی صحبت بگڑ چکی ہے اور کون جلد ہی گل کھلانے والی ہے، یہ ساری خبریں مع تفصیل ان کے پاس ہوتی تھیں۔

ان کے گھر میں زیادہ افراد نہیں تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ شوہر اور بیٹے کے آفس اور کالج جانے کے بعد اپنے گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر وہ بڑی دلجمعی سے اپنی دوسری مصروفیات میں لگ جاتی تھیں۔ پہلے پہل اسے ان کا دوسروں کی زندگیوں میں یوں دلچسپی لینا، ان کے گھروں میں تاک جھانک کرنا بڑا بے آرام کرتا تھا اور بتول آپا کو اس کے اس ٹھنڈے مزاج پر بڑی حیرت ہوتی تھی۔

دنیا کی ساری عورتوں کی تخلیق ایک مخصوص مٹی سے ہوئی ہے، جس میں محبت نفرت، ممتا جیسے بنیادی جذبات کے ساتھ ساتھ تجسس، جلن، حسد، حرص، دکھاوا، جیسے اضافی جذبات خاص طور سے شامل ہیں، کسی میں کم تو کسی میں زیادہ۔ بتول آپا نے اپنے تئیں اس کی عقل کے بند کواڑ کھولنے کی کوشش کی تھی اور وہ یہ سوچ کر مسکرا دی کہ وہ اپنی ٹوہ لینے کی عادت کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

''اب مجھے ہی دیکھ لو، مجھ میں تجسس سب سے زیادہ ہے۔'' انھوں نے فخریہ انداز میں اعتراف کیا تھا۔

''میرے بازو والی نرگس میں حرص بہت ہے، اس کے گھر میں تمھیں میرے گھر جیسا فرنیچر، پردے، چادریں سب ملے گا، وہ کپڑے بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے جیسے ہی خریدتی ہے۔ بی ونگ والی فردوس میں نمائش کوٹ کوٹ کر بھری ہے، سامنے والی شہناز میں جلن بہت ہے۔ ہر عورت کی فطرت میں یہ خالص زنانہ حسیات ہوتی ہیں، تم میں بھی کم سے کم ایک تو ہوگی، بس یہ ہے کہ تم اس سے ابھی تک واقف نہیں ہو۔'' انھیں اس بات کا پورا یقین تھا۔ مگر ربیعہ ان کی اس منطق کی قائل نہیں تھی۔

آج کل ان کی توجہ کا مرکز سامنے والی بلڈنگ میں، اس کے بالکل سامنے والے فلیٹ میں مقیم ثانیہ تھی۔ ان کے اپنے فلیٹ کی بہ نسبت ربیعہ کے فلیٹ سے اس کے گھر میں جھانکنا زیادہ سودمند اور آسان تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔ عمر تیس سے زیادہ ہو چکی تھی اور اب تک کنواری تھی۔ چند دنوں پہلے تک بتول آپا اس کے اب تک کنواری رہ جانے کی ممکنہ وجوہات پر سر کھپا رہی تھیں لیکن کچھ دنوں سے انھیں شبہ تھا کہ کہیں کچھ تو گڑبڑ ہے، کیوں کہ وہ تقریباً روز ہی شام میں تیار ہو کر گھر سے نکلتی تھی اور دو ڈھائی گھنٹہ بعد بڑے، اچھے موڈ، میں واپس لوٹتی تھی۔ اب ان کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے وہ شادی شدہ ہو، یا طلاق یافتہ، یا پھر شوہر اور سسرال والوں سے ناراض ہو کر گھر بیٹھی ہو اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچی تھیں کہ ضرور اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر چل رہا ہے۔

اس نے دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی میں پڑا آخری دوپٹہ اٹھایا اور جھٹک کر گرل پر ڈالتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے ثانیہ کے فلیٹ کی طرف دیکھا۔ یہاں سے اس کا پورا گھر نظر آتا تھا۔ وہ کچن میں تھی، اس کے بوڑھے والد صوفے پر نیم دراز اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے، ان کے قریب ہی فرش پر بیٹھی اس کی امی سبزی صاف کر رہی تھیں۔

وہ خالی بالٹی اٹھا کر پلٹی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

''آ گئیں۔'' اس نے بالٹی بالکنی میں ہی چھوڑی اور دروازہ کھولا۔

''تم تیار رہنا۔۔۔۔۔۔'' انھوں نے اندر آتے ہی کہنا شروع کیا۔ ''آج شام پانچ بجے ہم بھی اس کے پیچھے جائیں گے، دیکھیں تو آخر کہاں جاتی ہے، کس سے ملتی ہے۔۔۔۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بالکنی کے سامنے بیٹھ گئیں۔

''ہم کیسے۔۔۔۔۔'' اس اچانک فرمائش پر اس کا احتجاج بھی انھوں نے پورا نہیں سنا۔

''وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو، بس تم پانچ بجے سے پہلے تیار رہنا۔'' ان کی نظریں ثانیہ کے فلیٹ سے ہٹ کر اس کے بغل والی بلڈنگ پر مرکوز تھیں۔ اب وہ اپنی قوت بینائی کے دائرے میں آنے والے تمام فلیٹس اور ان کے مکینوں کا تسلی بخش معائنہ و مشاہدہ کرنے کے بعد ہی اس کرسی سے اٹھنے والی تھیں۔

ربیعہ کچن میں چلی آئی۔ دونوں کے لیے چائے بناتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل بتول آپا کے نئے منصوبے میں الجھا ہوا تھا۔ تاک جھانک اور سن گن لینے کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن یوں کسی کا پیچھا کرنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک بتول آپا کو صاف صاف انکار کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

''تو کیا میرے اندر بھی بقول بتول آپا عورتوں والی حسیات بیدار ہونے لگی ہیں؟''

''یہ تجسس ہے یا کچھ اور؟''

''بتول آپا کا تجسس انھیں کہاں تک لے جائے گا؟ آج پیچھا تو کل۔۔۔۔۔؟''

''کیا یہ کبھی ختم بھی ہوگا؟''

''شاید ان کے تجسس کی اس انتہا میں ان کے لیے کوئی سبق ہی چھپا ہو۔'' اس نے آخر میں جواز تلاش کر خود کو اس غیر اخلاقی حرکت پر مطمئن کرنا چاہا۔

وہ چند مہینوں پہلے سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ایسا بھی کر گزرے گی لیکن کچھ صحبتیں یوں ہی زور آور ہوتی ہیں۔ شام پانچ بجے وہ بتول آپا کے ساتھ اپنی بلڈنگ کے گیٹ پر چھپ کر کھڑی ثانیہ کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ذرا دیر بعد ثانیہ نے اپنی بلڈنگ سے نکل کر سڑک سے گزرتے آٹو رکشا کو روکا اور بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔ بتول آپا نے بھی پھرتی سے پیچھے سے آرہے آٹو رکشا کو روکا اور اسے لے کر اس میں سوار ہوگئیں۔

''اس آٹو کے پیچھے ہی چلنا ہے بھیا۔'' انھوں نے آٹو ڈرائیور کو تاکید کی۔

ثانیہ اپنا قریبی ریلوے اسٹیشن جوگیشوری چھوڑ کر اندھیری میں آکر رکی تھی۔ اس کے پیچھے اپنا آٹو روک کر وہ دونوں بھی اتر گئیں۔

''ربیعہ تم اس پر نظر رکھو، اتنی بھیڑ میں وہ کہیں گم نہ ہوجائے۔'' آٹو ڈرائیور کو کرایہ دیتے ہوئے بتول آپا نے اسے تنبیہ کی۔

''میں۔۔۔۔۔۔'' اس کی نظر ثانیہ پر ہی تھی۔

ڈرائیور سے فارغ ہو کر انھوں نے سامنے بھیڑ میں دیکھا۔

''کہاں گئی؟''

''ابھی تو یہیں تھی۔۔۔۔ سامنے۔۔۔۔۔''

''کیا۔۔۔۔۔؟ ارے تم کو نظر رکھنے کے لیے اسی لیے تو کہا تھا۔''

وہ ذرا جھنجھلا کر آگے بڑھیں اور سامنے پھیلی بھیڑ میں نظر دوڑا کر ثانیہ کو تلاش کرنے لگی۔

ربیعہ نے بے یقینی سے ثانیہ کا ہاتھ تھامے اس شخص کو ساؤتھ انڈین ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔

بتول آپا بالکل ٹھیک کہتی تھیں، وہ بالآخر ان کی منطق کی قائل ہو ہی گئی کہ ہر عورت کی مٹی میں کچھ اضافی حسیات اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس کے اندر بھی تھیں، جس کا اسے ابھی ابھی ادراک ہوا تھا۔ اس کی تخلیق میں پردہ داری اور بھرم قائم رکھنے والی مٹی شامل تھی، اپنی چاردیواری کی پردہ داری اور اپنی گرہستی کا بھرم۔

ثانیہ کے ساتھ جاتے شخص کو اس کی پشت سے پہچاننا اس کے لیے کوئی مشکل امر نہیں تھا اور تصدیق کے لیے آسمانی دھاری دار شرٹ کافی تھی جو اس نے خود صبح اپنے شوہر کو استری کر کے دی تھی۔

''چلیں بتول آپا۔'' اس نے واپسی کے لیے ان کا ہاتھ تھاما۔

Aasiya Raees Khan
70-B Roshan Heights
Plot No 42, Sector 40
Seawoods
Navi Mumbai-400706 (M.S)

حسنِ سخن

شہناز فاطمہ صدیقی

غزلیں

تشنگی کا عجب سا ڈر دیکھا
میں نے دریا کو اک نظر دیکھا

میٹھی گفتار کے تھے سب قائل
اس کی آنکھوں کا کس نے شر دیکھا

عکس کوئی ابھرتا چھپتا رہا
بس یہی خواب رات بھر دیکھا

روگ بڑھتا ہے جس کی صحبت میں
کوئی ایسا بھی چارہ گر دیکھا

پھر تمھارے خیال میں ہم نے
سایہ سا اک قریب تر دیکھا

مسلسل بے قراری چل رہی ہے
اداسی کی سواری چل رہی ہے

یہ آنسو ضبط کھو بیٹھے ہیں کیوں کر
یہ کس کی غم گساری چل رہی ہے

امیدوں کے پڑے تھے بیج دل میں
وہیں پر آبیاری چل رہی ہے

لبوں پر رہ گیا اک نام آ کر
کسی کی پاسداری چل رہی ہے

عداوت ہو گئی ہے ہر خوشی سے
غموں سے اپنی یاری چل رہی ہے

Shahnaz Fatima Siddiqui
H. No. 293/767
Old Haider Ganj, Lakarmandi
Lucknow-226003 (U.P)

لذیذ پکوان

پیری پیری فرائز

اجزا: چھلے اور فنگر کٹ آلو 2 سے 3 عدد

پیری پیری مصالحہ بنانے کے لیے:

کٹی لال مرچ 2 کھانے کے چمچے، نمک آدھا چائے کا چمچہ، چاٹ مصالحہ آدھا چائے کا چمچہ، لیمن سالٹ آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب: 2 سے 3 عدد چھلے اور فنگر کٹ آلو 5 منٹ کے لیے ابال لیں اور نکال لیں۔ اب اس پر کارن فلور ڈال کر کٹ کر لیں۔ پھر اس کو ڈیپ فرائی کر لیں اور پیری پیری مصالحہ ڈال کر سرو کریں۔ پیری پیری مصالحہ بنانے کے لیے 2 کھانے کے چمچے کٹی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچہ نمک، آدھا چائے کا چمچہ چاٹ مصالحہ اور آدھا چائے کا چمچہ لیمن سالٹ مکس کر لیں۔

رائس چکن کروکٹس

اجزا: چاول اُبلے ہوئے ایک کپ، چکن اُبلی ہوئی دو کپ، نمک ایک چائے کا چمچ، کالی مرچ ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ، چاٹ مصالحہ ایک کھانے کا چمچ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، ہری مرچ دو عدد، ہرا دھنیا ایک کپ، پودینہ دس پتے، چکن پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، چکن گارلک ساس تین کھانے کے چمچ، بریڈ کرمب ایک کپ، انڈے دو عدد

ترکیب: چاول اور چکن کو اچھی طرح میش کریں اور تمام مصالحہ ڈال کر مکس کریں۔ کباب کی شیپ دے کر اس پر انڈا لگائیں اور بریڈ کرمب لگا کر ڈیپ فرائی کر کے پیش کریں۔

آلو بینگن پالک پکوڑہ

اجزا: آلو دو عدد، بینگن ایک عدد، پالک دس عدد، بیسن دو کپ، نمک، لال مرچ، اجوائن ایک چائے کا چمچ

ترکیب: آلو اور بینگن گول گول کاٹ کر اس پر چاٹ مصالحہ لگا لیں۔ بیسن میں نمک لال مرچ، اجوائن ڈال کر بیسن گھول لیں اور آلو بینگن پالک کے پتے اس میں ڈپ کر کے فرائی کر لیں۔

مکس پکوڑے

آلو دو عدد، پالک کے پتے چھ عدد، بند گوبھی چوتھائی کپ، پیاز ایک عدد (باریک کاٹ لیں)، بیسن ایک کپ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، دھنیا ایک چائے کا چمچ، انار دانہ ایک کھانے کا چمچ، نمک، لال مرچ، میتھی ایک کھانے کا چمچ تمام سبزیوں کو بیسن میں مکس کر کے گھولیں اور فرائی کر لیں۔ چاٹ مصالحہ ڈال کر پیش کریں۔

ٹوفو سلاد:

اجزا: ٹوفو 150 گرام، کٹا لہسن 3 سے 4 جوے، کٹے ٹماٹر 2 عدد،

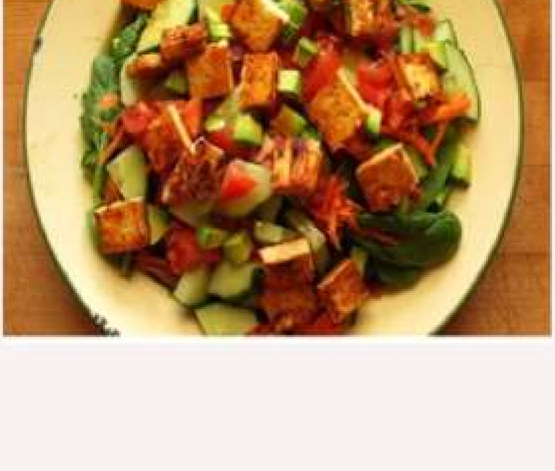

سلاد پتے 2 سے 3 عدد، ہری پیاز 2 سے 3 عدد، ہری مرچ 1 عدد، کٹی کالی مرچ آدھا چائے کا چمچ، لیموں کا رس 2 سے 3 کھانے کے چمچے/ زیتون کا تیل ایک چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ

ترکیب: مکسنگ باؤل میں 2 سے 3 کھانے کے چمچے لیموں کا رس، آدھا چائے کا چمچ کٹی کالی مرچ اور 3 سے 4 جوے کٹا لہسن کو مکس کر لیں۔ ڈریسنگ تیار ہے۔

سلیڈ بنانے کا طریقہ: 150 گرام ٹوفو کو فرائی کر کے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ اب مکسنگ باؤل میں ٹوفو، 2 عدد کٹے ٹماٹر، 2-3 عدد ہری پیاز، 2-3 عدد سلاد پتے اور ڈریسنگ ڈال کر مکس کر لیں۔ آخر میں سلیڈ پلیٹ میں نکال کر سرو کریں۔

ڈبل روٹی کا حلوہ

اجزا: ڈبل روٹی آدھا پیک، چینی ایک کپ اور جتنی آپ پسند کریں، الائچی پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، مکھن آدھی ٹکی، دودھ ایک کپ، گھی 7 کھانے کے چمچے، ڈرائی فروٹ حسب ضرورت

ترکیب: ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کو چورا کر لیں۔ ایک کڑاہی میں گھی ڈالیں اور ڈبل روٹی کے چورے کو اتنا بھونیں کہ وہ ہلکا براؤن ہو جائے اب دودھ، الائچی پاؤڈر اور چینی شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں اور دودھ خشک ہونے تک درمیانی آنچ پر پکائیں۔ پھر مکھن ڈال کر بھونیں۔ جب دیکھیں کہ آمیزہ حلوے کی شکل میں آ گیا ہے تو چولہے سے اتار کر خشک میوے کے ساتھ سجائیں اور کھانے کے لیے پیش کریں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی

دوران حمل خون کی کمی
احتیاط و علاج

طبی سائنس میں نئے انکشافات کے باوجود بعض مسائل اب بھی اہم ہیں اور ان کی طرف توجہ کی کمی خطرناک نتائج کو جنم دے سکتی ہے۔ حمل(Pregnancy) کے دوران خون کی کمی (Anaemia) اسی طرح کی اہم صورتحال ہے، اس کی طرف حمل شروع ہوتے ہی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

حمل کے زمانہ میں خون کی کمی ہونے سے ماں اور بچہ دونوں میں آکسیجن کی ضروری مقدار نہیں پہنچتی ہے اگرچہ قدرتی طور پر اس دوران جسم میں خون کی مقدار بڑھ جاتی ہے لیکن عام طور سے غذا کے ذریعہ آئرن (فولاد) کی مناسب مقدار نہ پہنچنے سے خون جتنا بننا چاہیے نہیں بنتا۔ یہ صورتحال برقرار رہتی ہے اگر احتیاطی تدابیر اور علاج نہ کیا جائے تو اس کے خطرناک نتائج اور کبھی کبھی مہلک اثرات سامنے آتے ہیں۔ عام طور سے اس دوران تین طرح کی خون کی کمی ہوتی ہے۔

1۔ فولاد (آئرن) کی کمی سے ہونے والی خون کی کمی Iron Deficiency Anaemia

اس طرح کے قلت دم میں خون کے اندر آئرن (فولاد) کی ضروری مقدار نہیں پہنچتی اور ہیموگلوبن کی مقدار کم ہوجاتی ہے، چونکہ ہیموگلوبن آکسیجن کو ماں اور بچے دونوں تک پہنچاتی ہے لہذا اس کی کمی سے دونوں کو پریشانیاں ہوسکتی ہیں۔

2۔ فولیٹ کی کمی سے ہونے والی خون کی کمی Folate Deficiency Anaemia

یہ ایک قسم کا وٹامن ہے جو طبعی طور پر خون کے اندر پایا جاتا ہے اور ہری سبزیوں کے کھانے سے بنتا ہے، اس سے جسم کے اندر نئے

خلیات (New cells) بنتے ہیں ۔ جسے آج کل کیمیاوی طور پر تیار کرتے ہیں اوراسے Folic Acid کہتے ہیں اس کی کمی سے بچہ کی پیدائش میں کئی طرح کی دشواریاں ہوجاتی ہیں خاص طور سے بچہ کا وزن کم ہوجاتا ہے۔

وٹامن بی 12 کی کمی سے ہونے والی خون کی کمی Vitamin B12 deficiency Anaemia

جسمانی نشوونما کے لیے وٹامن بی 12 بہت ضروری ہے۔ حمل کے دوران اس کی کمی سے صحت مند خون کی پیدائش نہیں ہوتی یہ صورتحال حاملہ (Pregnant) خواتین کے انڈا، گوشت اور دودھ ومکھن کے کم استعمال سے پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے بھی بچہ کی پیدائش کے وقت مختلف پریشانیاں سامنے آسکتی ہیں۔

یہ تینوں صورتیں کم عمر میں حمل ہونے، جڑواں بچوں میں، حمل کے زمانہ میں زیادہ دنوں تک متلی ہونے اور خوراک کم ہوجانے میں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔

خون کی کمی کی پہچان

خون کی کمی میں عام طور سے درج ذیل علامتیں پائی جاتی ہیں۔

عورت کی جلد کا رنگ زرد ہوجاتا ہے، کمزوری اور تکان بہت ہوتی ہے، سستی چھائی رہتی ہے، سانس پھولتی ہے، اور دل کی دھڑکن (Heart beat) تیز ہوجاتی ہے، بھوک کم ہوجاتی ہے، چکر آتے ہیں اور آنکھوں کے چاروں طرف سیاہ حلقے پڑجاتے ہیں۔

احتیاط اور علاج

بطور احتیاط برابر ہیموگلوبن کی جانچ کراتے رہیں، اگر یہ فیصد 9 سے کم ہو تو ڈاکٹر کے مشورہ سے اس کی تدبیر کریں۔

حاملہ کی غذا پر خصوصی توجہ دیں خاص طور سے ہری سبزیوں، گوشت، انڈا دودھ اور گھی کی مقدار غذا میں بڑھادیں۔

متلی ہو تو اس پر خصوصی توجہ دیں۔

حاملہ کا وزن کرلیں اور ہر ہفتہ یا پندرہ دن پر وزن کریں۔

علاج

طب یونانی میں خون کی کمی کے لیے

شربت فولاد ، اور قرص خبث الحدید اور قرص فقر الدم جیسے مرکبات استعمال کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ ایلوپیتھک میں خون میں ہیموگلوبن کے فیصد کے اعتبار سے آئرن اور فولک ایسڈ کی گولیاں اور کیپسول استعمال ہوتے ہیں، ضرورت پڑے تو آئرن کے انجکشن اور کبھی خون چڑھانے کا مشورہ بھی دیا جاتا ہے۔

بہر حال ذہن میں رہے کہ ان دواؤں کے استعمال سے پہلے مناسب یہی ہے کہ طبیب سے مشورہ کرلیں پھر یہ دوائیں استعمال کریں۔

□□□

Dr. S. M. Hassan
476/6C Behind Madeh Ganj Police Chowki
Sitapur Road
Lucknow. 226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

مسوں کوختم کرنے کے لیے4 انتہائی آسان گھریلو نسخے

کیا آپ کے جسم پر مسے (اسکن ٹیگ) ہیں اور آپ ان سے پریشان ہیں تو اب پریشانی کی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ گھر بیٹھے ان سے باآسانی جان چھڑا سکتے ہیں اور اس کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔

عموی طور پر مسے جسم کے کسی بھی حصے پر نکل آتے ہیں لیکن عموماً گردن اور اطراف میں پائے جاتے ہیں جبکہ زیادہ تر حاملہ خواتین یا درمیانی عمر کی عورتیں اس کا شکار ہوتی ہیں لیکن اب تک کسی بھی تحقیق سے مسے نکلنے کی وجوہات ثابت نہیں ہوسکیں۔

مسوں کا صحت پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا البتہ ان کی جسم پر موجودگی دکھنے میں بری لگتی ہے۔ بعض اوقات لوگ مسوں کو سرجری کے ذریعے بھاری رقم ادا کرکے ختم کرواتے ہیں لیکن حیران کن طور پر انتہائی آسان گھریلو نسخوں کے ذریعے ان سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

بیکنگ سوڈا اور کیسٹر آئل

ویسے تو مسوں کو ختم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں لیکن جسم کے کسی بھی حصے سے مسے کو نکالنے کا بہترین طریقہ بیکنگ سوڈا (کھانے کا میٹھا سوڈا) اور کیسٹر آئل کا پیسٹ ہے۔

دو چمچ میٹھے سوڈے میں ایک چمچ کیسٹر آئل شامل کر کے اس مرکب کو مسے پر لگائیں۔

اس عمل کو روزانہ دو سے تین بار دہرائیں اور اس وقت تک دہراتے رہیں جب تک مسہ خود ہی ختم نہ ہوجائے۔

ناخن پالش

ناخن پالش کے ذریعے بھی مسوں کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ کوشش کریں کہ بغیر رنگ والی ناخن پالش مل جائے، اگر دستیاب نہ تو کسی بھی رنگ والی ناخن پالش کو مسوں پر دن میں کم ازکم 3 بار لگائیں۔

اس عمل کو 2 ہفتے تک جاری رکھیں، اگر مسے کا سائز تل (مول) جتنا ہوتو اس کے خاتمے میں ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔

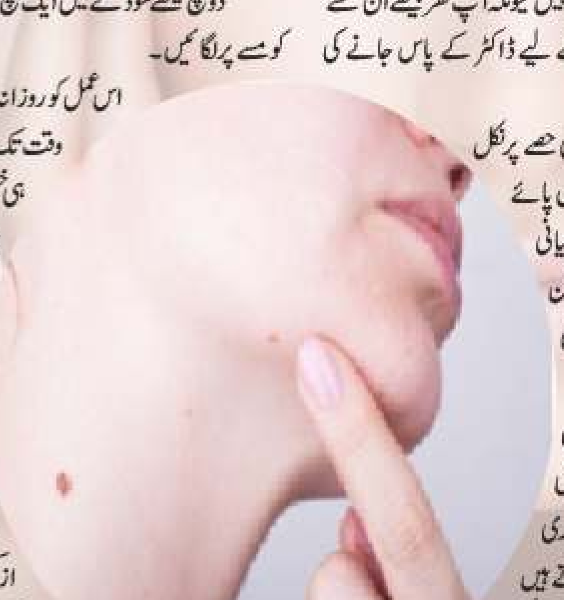

باندھنا

مسے کو ختم کرنے کا ایک آسان طریقہ دھاگے کا استعمال بھی ہے۔ مسے کو دھاگے کے ذریعے باندھنے سے اس کی نشونما رک جاتی ہے اور سائز نہیں بڑھتا۔ مسے کو ایک ہفتے تک دھاگے سے باندھنے سے اس کا خاتمہ ہوسکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو احتیاطاً دھاگے کا استعمال نہ کریں کیونکہ ممکنہ طور پر مسہ میں درد اور سوجن ہوسکتی ہے۔

گھوڑے کی دم کا بال

یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔ کسی کوچوان سے گھوڑے کا بال لے لیجیے اور اسے مسے کے گرد باندھیے۔ کہتے ہیں کہ اس سے چند روز میں مسہ جھڑ کر ختم ہوجاتا ہے۔

ملتانی مٹی چہرے کی گوری رنگت کے لیے

یہ واحد ماسک ہے جو ہر قسم کی جلد کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ چہرے کے کھلے ہوئے مسامات کو بند کرتا ہے ساتھ ہی چہرے کی جلد کو کس دیتا ہے۔ اس ماسک کو ہر قسم کے چہرے والی خواتین استعمال کرسکتی ہیں۔

ملتانی مٹی کا ماسک بنانے کی ترکیب: کچی ملتانی مٹی ایک انڈے کی سفیدی اور ایک چائے کا چمچ شہد ملا کر اس کا پیسٹ بنالیں اور چہرے پر لگالیں۔ ماتھے سے لے کر گردن تک لگائیں چہرے اور گردن کا کوئی حصہ خالی نہ رہے یہ کوشش کریں کہ آنکھیں بند ہوں اور چہرہ بالکل سپاٹ رہے جب آپ یہ محسوس کریں کہ پیسٹ خشک ہوگیا ہے اور تناؤ محسوس ہونے لگے تو چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

خشک جلد کے لیے ماسک:

خشک جلد کے لیے ملتانی مٹی کو پیس کر اس میں تھوڑی سی پسی ہوئی ہلدی ملالیں ساتھ ہی چند قطرے روغن بادام کے ڈال کر پیسٹ بنالیں پیسٹ نرم ہونا ضروری ہے چہرے پر لگا کر پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر چہرہ دھولیں اس پیسٹ کے استعمال سے آپ کا چہرہ دن بدن نکھرتا چلا جائے گا۔

چکنی جلد کے لیے ماسک:

ایک پیالی میں انڈہ توڑ کر سفیدی نکال لیں زردی الگ کر دیں سفیدی میں چند قطرے لیموں کے عرق کے ملالیں پھر ٹی سپون کی مدد سے اتنا پھینٹیں کہ پیالی میں جھاگ بن جائے اب اسے چہرے پر لگائیں جب خشک ہوجائے تو ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔

اجزا: چینی اور گرم پانی

ایک خالی پیالے میں پسی چینی شامل کریں پھر گرم پانی شامل کر کے چینی گھول لیں۔

اپنی انگلیوں کے پوروں کی مدد سے اپنے چہرے پر ملیں اور پندرہ منٹ بعد تولیے سے صاف کرلیں۔

چند دنوں کے استعمال سے آپ کا چہرہ کلین ہوجائے گا۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

"خواتین دنیا" اکتوبر 2019 موصول ہوا۔ سرورق پر خزاں رسیدہ سوکھے درخت کی بوسیدہ ٹہنیوں سے ایک شکل اجاگر کی گئی ہے۔ ان میں بے دم پرندوں کی شبیہ صنف نازک کے تئیں غمخواری و یگانگت کو ظاہر کرتی ہیں۔ سرورق کے اس خاکہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آدمی کبھی اتنا نادان نہ رہا ہوگا جتنا کہ اب ہے۔

اندرونی صفحات میں کوئی درجن بھر ابواب دیئے گئے ہیں۔ اداریہ میں اُردو و ہندی کے باہمی رشتہ کو استوار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ ویسے حالات کا تقاضہ یہی ہے۔ بہت سے لوگ تو ایک زمانے سے اُردو کو ہندی کہتے آئے ہیں تو اس میں قباحت کیا ہے۔ "شخصیت" کے ذیل میں ندا فاضلی کی شاعری پر مضمون لکھا گیا ہے کہ ان کے کلام میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ "پرواز کے نئے آسمان" میں گورکھپور یونیورسٹی کی طالبہ عفت امین نے دنیا کا سب سے روشن مادہ دریافت کرکے اپنے وطن کا نام دنیا بھر میں روشن کردیا۔ "نکہت سخن" میں آٹھ شاعرات کے سولہ اشعار دیے گئے ہیں۔ تمام اشعار قابل داد ہیں۔ "جہانِ نسواں" میں آٹھ عنوانات ہیں۔ ان میں "ادبی کوئز" بہترین عنوان ہے۔ "قانون میں خواتین" کے تحت خواتین کی تعلیمی پسماندگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ انتہائی معلوماتی مضمون ہے۔ تمام طلبہ اس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔ "کہانیاں" میں تین کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ پڑھ کر تو دیکھئے آپ کو خود بھی ایسی کہانیاں لکھنا آسان لگے گا۔

"حسن سخن" کے تحت دو غزلیں ہیں۔ "لذیذ پکوان" میں پُرتکلف اور ملذذ پکوانوں کی تیاری کے طریقے دیئے گئے ہیں۔ انھیں عمل میں لاکر لذت اٹھائی جاسکتی ہے۔ "صحت" کے تحت چھاتی کے سرطان کی علامات اور ادویات کا ذکر ہے۔ پروردگار اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

آرائش و زیبائش کے ذیل میں حسن کی آرائش و نکھار کے طرز مندرج ہیں۔ انھیں آزمایا جاسکتا ہے۔ فرصت شرط ہے۔ "تاثرات" میں چار مراسلے شامل ہیں جن میں کچھ وضاحتیں، تبصرے، توصیفی عبارتیں شامل ہیں۔ دیکھئے ان میں کیا قابل اعتنا ہیں اور کیا قابل نظر انداز۔ اخیر میں "خواتین خبرنامہ" درج ہے۔ یہ آپ کی معلومات اور حیرت میں اضافہ کا باعث ہوگا۔ بہرحال اس حسین وجمیل شمارہ کے بارے میں یہی احساس ہے کہ فیض احمد فیض:

وہ دل کہ تیرے لیے بیقرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

مصطفی ندیم خان غوری، زرّین ولا، بی-11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

ماہنامہ 'خواتین دنیا' اکتوبر 2019 اپنی تمام آب وتاب کے ساتھ نظرنواز ہوا۔ بلاشبہ یہ ایک معیاری رسالہ ہے جو خواتین کی باطنی اور ظاہری صلاحیت کو اجاگر کرکے معاشرے میں ایک اہم مقام فراہم کرنے کی غیر معمولی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ افسوس کہ ترقی پسندی کے اس دور میں آج بھی عورت کہیں نہ کہیں پستی کا شکار ضرور ہے جو معاشرے کی تنگ نظری اور روایتی نظریے کا نتیجہ ہے۔ ایسے میں یہ رسالہ مشعل راہ بن کر کامیابی سے اپنا فرض انجام دے رہا ہے۔

تمام مضامین اور افسانے و دیگر موضوعات پر تبصرے قابل ستائش اور سبق آموز ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرکے کونسل کی محنت اور کاوشیں اس کو مقبولیت اور کامیابی کی بلندی پر پہنچائے۔ آمین

تحسین کاظمی، ہاپوڑ

یوپی کے بعد راجستھان کی مسلم لڑکیوں نے کیا کمال
5 بیٹیاں جج کے امتحان میں کامیاب

24 نومبر 2019 (جے پور، اودھ نامہ) ملک بھر کی مسلم بیٹیوں میں جیوڈیشل سروسز کے تئیں رجحان لگاتار بڑھ رہا۔ 3 مہینے قبل اتر پردیش جیوڈیشل سروسز میں 18 مسلم بیٹیوں کے بعد اب راجستھان جیوڈیشل سروسز میں 5 مسلم بیٹیوں کا انتخاب ہوا ہے۔ یہ تعداد کم نظر آتی ہے، لیکن اتر پردیش میں 610 سیٹ کے مقابلے راجستھان میں صرف 197 سیٹ تھی۔ خاص بات یہ ہے کہ ان 197 میں سے صرف ایک مسلم نوجوان محمد فیصل کا سلیکشن ہوا ہے۔

راجستھان میں حال ہی میں جیوڈیشل سروسز کے لیے کم از کم عمر 23 سال سے گھٹا کر 21 سال کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ٹاپ رینک پرتاپ ملک کے سب سے کم عمر کے جج بن گئے ہیں۔ راجستھان جیوڈیشل سروس کے جمعرات کے روز برآمد نتیجہ میں ثانیہ منیہار، ساجدہ، ثنا، ہما کوھری، شہناز خان نے اس مرتبہ 'یور آنر' کہلانے کا حق حاصل کیا ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ ان میں سے چار لڑکیاں بے حد پسماندہ طبقہ سے آتی ہیں۔ راجستھان میں خواتین کی شرح خواندگی بہت کم ہے اور مسلم لڑکیاں تو بے حد پچھڑی ہوئی ہیں۔ 2017 میں یہاں کی دو خواتین جہاں آرا اور افروز بیگم کے 'قاضی' بننے پر کافی خوشی منائی گئی تھی۔ دونوں خواتین

نے مہاراشٹر سے اسلامی شریعہ قانون میں پڑھائی کے بعد قاضی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

راجستھان جیوڈیشیل سروسز کے برآمد نتائج میں ایک بات حیرت زدہ کرنے والی ہے۔ وہ یہ کہ سرفہرست 10 منتخب امیدواروں میں سے 8 لڑکیاں ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی دیکھنے میں آرہی ہے کہ رزلٹ میں دو منیہاری برادری کی لڑکی کا نام شامل ہے اور پہلی بار کوئی منیہاری لڑکی جج بنی ہے۔ اسی طرح راجستھان کی سب سے پسماندہ کھوری برادری کی ہما بھی جج بن گئی ہیں۔ جودھپور کی ساجدہ اور جے پور کی شہناز خان نے بھی اس مقام تک پہنچنے میں کافی جدوجہد کی ہے۔

جے پور کی عرشی نور کے مطابق لڑکیوں میں ایک زبردست تبدیلی دیکھنے کو مل رہی ہے۔ مسلم لڑکیوں میں جیوڈیشیل سروسز کی طرف رجحان لگاتار بڑھ رہا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس میں پسماندہ طبقات کی لڑکیاں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔

راجستھان میں 9 فیصد مسلم آبادی ہے جو اتر پردیش کی 22 فیصد آبادی کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یہاں خواتین کی شرح خواندگی محض 52 فیصد ہے جبکہ مسلمانوں میں یہ محض 44 فیصد ہے۔ حالانکہ 2001 کے مقابلے میں اس کارکردگی کو اچھا نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو خوش آئند ہیں۔ جھنجھنو کی رہنے والی ثانیہ کو 30 واں رینک ملا ہے جبکہ ساجدہ کو 37 واں، ثنا حکیم کو 130 واں، ہما کھوہری کو 136 واں اور شہناز کو 143 واں رینک حاصل ہوا ہے۔

اودے پور کے خان جی پیر علاقے کے غوثیہ کالونی میں رہنے والی شہناز لوہار اودے پور سے جج بننے والی واحد مسلم لڑکی ہے۔ شہناز نے پڑھائی اپنے وکیل والد سلیم خان کی رہنمائی میں کی اور یہ ان کی پہلی کوشش تھی۔ شہناز کہتی ہیں کہ ان کی کامیابی کا کوئی خاص فارمولہ نہیں ہے۔ جب بھی گھر کے کام سے فرصت مل جاتی تھی تو پڑھائی کر لیتی تھیں۔ خاص بات یہ ہے کہ منتخب ہونے والی پانچوں لڑکیاں پوری طرح سے سوشل میڈیا سے دور رہتی ہیں اور گھریلو ہیں۔ واحد مسلم نوجوان محمد فیصل بھی کم پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری طرف جون میں آئے اتر پردیش جیوڈیشیل سروسز کے نتائج میں 38 مسلم بچے منتخب ہوئے تھے جن میں سے 18 لڑکیاں تھیں۔ اب ان سبھی کو تعیناتی مل گئی ہے۔ سہارنپور کی فرح کو مظفر نگر اور مظفر نگر کی ہما کو سہارنپور بھیجا گیا ہے جبکہ کھتولی کی زینت کو بھی سہارنپور بھیج دیا گیا ہے۔ جسیم خان کو بدایوں میں جونیئر جج بنایا گیا ہے۔ مہر جہاں کو اوریہ، تمیم شاہنواز کو بارہ بنکی، بشریٰ نور کو کانپور، بشریٰ خورشید کو متھرا، مینا اختر کو ایٹہ بھیجا گیا۔

بہرحال، راجستھان کے رکن اسمبلی واجب علی کے مطابق ریاست کے مسلمانوں کے لیے یہ نہایت ہی اچھی خبر ہے، خصوصاً لڑکیوں کے لیے۔ یہاں مسلم لڑکیاں تعلیم کے معاملے میں بہت پیچھے ہیں، کیونکہ لڑکیاں بہت جلد اسکول جانے سے روک لی جاتی ہیں۔ آگے پڑھائی کے لیے انھیں بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ راجستھان جیوڈیشیل سروسز کا تازہ رزلٹ یقینی طور پر دوسری بیٹیوں کو حوصلہ دے گا۔

65 برس کی عمر میں بیٹا کھو کر صدمے میں تھیں، 70 کی عمر تک آتے آتے فتح کی ڈیتھ ریس

7 اکتوبر 2019 (نو بھارت ٹائمس) بولویہ کی مرتھا منوج پانچ سال پہلے تک ایک عام سی عورت تھیں۔ جب ان کی عمر 65 سال کے

قریب تھی تو اچانک ہی ان کے بیٹے کی موت واقع ہو گئی۔ مرتھا بیٹے کی موت کے غم سے پریشان تھیں۔ ان کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ان کو ماہر نفسیات سے صلاح لینی پڑی۔ ڈاکٹر نے انھیں کچھ نئی مصروفیات میں مصروف رہنے کی صلاح دی۔ ان کے پڑوسیوں نے انھیں سائیکل چلانا سکھائی۔

مرتھا اب ایک نئے سفر کی شروعات کر چکی تھیں۔ ان کا اپنا غم اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ سائکلنگ کرنا ان کے لیے اب جنون بن چکا تھا۔ ان کا عالم یہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ملک اور جنوبی امریکہ کی ممتاز بائک ریس میں دعویدار بنیں۔ 11 ہزار فٹ کی اونچائی پر بنی دنیا کی سب سے گھماؤ دار سڑکوں کو 'ڈیتھ روڈ' کہا جاتا ہے۔ اس ڈیتھ روڈ پر سائکلنگ کر کے 70 سال کی مرتھا نے 67 کلومیٹر کی اسٹرانگ ریس فتح کی۔ وہ اس مقابلے کی سب سے زیادہ عمر دراز خاتون تھیں لیکن عمر، بارش، دھند، ٹیڑھی میڑھی سڑکیں اور چٹانیں بھی مرتھا کی راہ میں حائل نہیں ہو پائیں۔ چھ بچوں کی دادی مرتھا نے گمنامی اور دکھ کے سایہ سے نکل کر اب دنیا بھر میں اپنا نام نمایاں کر لیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب: محمد حسن

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

قومی تہذیب کا مسئلہ

مصنف: سید عابد حسین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 220

قیمت: 120 روپے

اردو املا

مصنف: رشید حسن خاں

پانچویں طباعت: 2019

صفحات: 706

قیمت: 240 روپے

کلیاتِ سراج

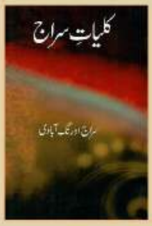

مصنف: سراج اورنگ آبادی

مرتب: عبدالقادر سروری

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 732

قیمت: 320 روپے

تفہیمات وترجیحات

مصنف: شیخ عقیل احمد

صفحات: 237

قیمت: 130 روپے

مجمع البحرین

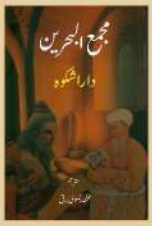

مصنف: داراشکوہ

مترجم: طلحہ رضوی برق

صفحات: 36

قیمت: 45 روپے

علامہ فضل حق خیرآبادی: چند عنوانات

مصنف: خوشتر نورانی

صفحات: 248

قیمت: 110 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2019, Vol.0 3, Issue: 12 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025